# آخری باب

## یہ کہانی میری تھی

''اسکو سی پی آر دینا ہے فوراً!''سب سے پہلے حسین نے اپنے حواس سنبھالے تھے۔

''عائشہ جی! جزا کو پیچھے ہٹائیں۔''رضا نے کہا تو عائشہ جی نے فوراً روتی بلکتی جزا کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا، اُسکی جگہ رضا نے نوید کا سر نیچے رکھا تاکہ اُسے سیدھا لٹا سکے۔ اگلے ہی لمحے حسین نے اسے سی پی آر دینا شروع کیا تھا۔

''یہ سانس نہیں لے رہا۔۔۔''عمر نے اُسکے ناک کے پاس انگلی رکھتے کانپتی آواز میں کہا۔

''نہیں! یہ اُٹھ جائیگا۔''علی نے انکار کیا تھا یا خود کو تسلی دی تھی؟ معلوم نہیں!

''یہ نہیں اٹھ رہا۔۔۔ میری مدد کرو۔۔۔''حسین چلایا تھا۔ سی پی آر کا اثر نہیں ہوا تھا۔

''بھائی۔۔۔ بھائی!''جزا بلک بلک کر رو رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ اُسے شدید پینک اٹیک آنے والا تھا۔ یکدم ہی ذہن میں کسی کی آواز گونجی۔

**''ایسی حالت میں حواس باختہ نہیں ہوتے۔ اگر آپ ہی پینک (خوفزدہ) کریں گی، تو مریض کی طبیعت اور بگڑے گی، آئندہ اگر ایسا ہو تو سب سے پہلے اپنے حواس بحال رکھ کر ایمبولینس کو کال کریں، پھر مریض کو ابتدائی طبّی امداد دیں۔''**

''ایمبولینس۔۔۔ ایمبولینس۔۔۔''اُسے یاد آیا تو جلدی سے اپنے پرس سے فون نکالا تاکہ ایمبولینس کو فون کر سکے۔

''نوید۔۔۔ نوید! آنکھیں کھولو یار!''وہ علی اُسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ حسین اور مقدم اب مل کر اُسے سی پی آر دے رہے تھے۔ پر اُسکے ہاتھ ڈھلک چکے تھے، چہرہ نیلا پڑنے لگا تھا۔ رضا نے اُسکی کلائی پکڑ کر نبض چیک کی۔

''اِسکی نبض نہیں چل رہی حسین! سی پی آر کا فائدہ نہیں ہو رہا۔''رضا چلایا تھا۔

''چاہے نبض چلے یا نہ چلے، سی پی آر اُس وقت تک نہیں رکنا چاہیے، جس وقت تک ایمبولینس نہیں آجاتی۔'' وہ چلایا تھا۔

''ایمبولینس۔۔۔ایمبولینس نہیں بلائی میں نے۔۔۔'' رضا اٹھنے لگا۔

''میں نے ایمبولینس بلالی ہے۔'' جزا نے ہانپتے ہوئے اُسے کہا۔

''بھائی کیوں نہیں اُٹھ رہے؟'' وہ رو دی، عائشہ جی نے اُسکا ہاتھ تھاما۔ سب کی موجودگی کے باعث وہ نوید کے قریب نہیں جا پا رہی تھی۔ مقدّم، حسین اور اب علی بھی مل کر اُسے سی پی آر دے رہے تھے۔ پر پستول سے نکلی گولیاں کھا کر بھی چلنے والا نوید آج نہیں اُٹھ رہا تھا۔ ہر بات پر ''میں ٹھیک ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوا'' کہنے والا نوید آج آنکھیں نہیں کھول رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اُس کا چہرہ دوسری جانب ڈھلک گیا۔

''نوید!'' وہ سب ساتھ چلائے، اُسکی نبض مکمل رک چکی تھی۔

''بھائی۔۔۔بھائی۔۔۔'' جزا اکھڑتے سانس کے ساتھ گھاس پر بیٹھتی چلی گئی۔

''اُٹھو نوید!۔۔۔اُٹھو۔۔۔'' مقدّم کے ہاتھ کانپ اٹھے، اُسے اِس حالت میں دیکھ کر، وہ پیچھے ہوا اور پتھرائی نظروں سے حسین کو دیکھا۔ شاید! اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ نوید مر چکا ہے۔ پر حسین نہیں رکا تھا۔ اُس نے سی پی آر بند نہیں کیا۔ اگلے ہی لمحے ایمبولینس کی آواز آئی تو جزا اٹھی اور بھاگ کر دروازہ کھولا۔

''جلدی کریں۔۔۔ جلدی کریں! میرا بھائی مر جائیگا۔۔۔ پلیز!'' وہ روتے ہوئے ایمبولینس کے عملے کو کہہ رہی تھی۔ ایمبولینس بہترین اور جدید طبّی سہولیات سے آراستہ تھی۔ پیرامیڈک عملہ اسی میں موجود تھا۔ وہ ایمبولینس پورچ میں لے آئے۔

''سی پی آر کب سے چل رہا ہے؟'' پیرامیڈیک ڈاکٹر نے آتے ہی پوچھا۔

''تقریباً چھ منٹ۔۔۔'' مقدّم نے ڈوبتی آواز کے ساتھ کہا، اُسکے دل کو کسی انہونی کا خدشہ تھا۔

''جاری رکھو!'' اُس نے عملے سے کہا اور ایمبولینس میں موجود مشینوں کو فعال کرنے لگا۔ عملے نے فوراً نوید کو اسٹریچر پر ڈالا، اور سی پی آر دیتے ہوئے ہی اُسے ایمبولینس میں منتقل کیا۔

''نبض نہیں مل رہی؟'' پیرامیڈک ڈاکٹر نے نوید کی گردن پر ہاتھ رکھتے کہا۔اُسکے ہاتھ اب اکڑ چکے تھے۔

''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ہمیں اسی وقت انہیں اے ای ڈی دینا ہوگا۔''ڈاکٹر نے کہتے ہوئے اے ای ڈی کیس کھولا۔

''آپ لوگ پیچھے رہیں۔'' عملے نے اُنہیں پیچھے ہٹایا۔ایمبولینس کے کھلے حصے سے نوید نظر آرہا تھا۔

AED آن ہوتے ہی مشین کی مصنوعی آواز ابھری:

"Apply pads to patient's bare chest"

پیرامیڈیک نے اُسکا کرتا قینچی سے کاٹا، پھر ایک الیکٹروڈ دائیں سینے کے اوپری حصے پر چپکایا اور دوسرا بائیں جانب پسلیوں کے نیچے۔

مشین نے فوراً اگلا حکم دیا:

"Analyzing heart rhythm. Do not touch the patient"

''سب پیچھے ہٹو!'' پیرامیڈک نے اُنہیں پیچھے ہٹایا۔ایمبولینس کے پاس موجود سب لوگ چند قدم پیچھے ہو گئے۔ جزا کے دونوں ہاتھ برف ہو رہے تھے۔رو رو کر آنکھیں سوجنے لگی تھیں۔چند سیکنڈ تک صرف مشین کی ہلکی بیپ سنائی دیتی رہی۔ پھر آواز آئی:

"Shock advised"

پیرامیڈک نے ایک نظر سب پر ڈالی۔

''کوئی مریض کے قریب نہ آئے!''اُس نے ایک بار پھر متنبہ کیا۔

''سب دور ہیں سر!'' دوسرے پیرامیڈک نے سب کلیئر ہونے اشارہ کیا، تو ڈاکٹر نے پیڈز کو مضبوطی سے تھاما۔اور اگلے ہی لمحے شاک بٹن دبا دیا گیا۔نوید کا جسم ایک جھٹکے سے اکڑا اور پھر واپس ڈھلک گیا۔

AED نے فوراً اعلان کیا:

"Begin CPR"

ڈاکٹر نے پیڈز ہٹائے اور دوبارہ سینے پر سی پی آر دینے لگا، جبکہ دوسرا پیرامیڈک وقت دیکھ رہا تھا۔ دو منٹ تک مسلسل سی پی آر جاری رہا۔ پسینہ عملے کے ماتھوں پر نمایاں تھا۔ اُنکی سانسیں نوید کے ساتھ اٹک گئی تھیں جیسے۔

پھر مشین نے دوبارہ کہا:

"Stop CPR. Analyzing rhythm"

عملہ رک گیا۔ کچھ لمحوں کی خاموشی چھائی۔ نوید کی دھڑکن بحال نہ ہوئی۔ آواز پھر ابھری:

"Shock advised"

ڈاکٹر نے پیڈز دوبارہ مضبوطی سے تھامے اور دوسرا جھٹکا دیا گیا۔ ایک بار پھر نوید کے جسم نے جھٹکا کھایا تھا۔ جزا نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے، آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔ وہ مزید نہیں سہہ سکتی تھی۔ ڈاکٹر نے دوبارہ CPR شروع کیا۔ تقریباً تیس سیکنڈ گزرے تھے کہ پیرامیڈک اچانک جھکا۔

''رکیں۔'' وہ نبض چیک کرنے لگا۔

ایک لمحہ سرکا۔۔۔

پھر دوسرا۔۔۔

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھری۔ اسکرین پر دھڑکن بحال ہونے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

''نبض واپس آگئی ہے۔'' وہ چیخا۔ سب تیزی سے آگے بڑھے، جزا نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ نوید کی پلکیں ہلکی سی جنبش کرنے لگی تھیں۔ سینے سے ایک گہرا، اور بے ترتیب سانس خارج ہوا۔ اُسکا سانس بحال ہوا تھا تو جیسے وہاں کھڑے ہر شخص کا سانس بحال ہوا تھا۔

''آکسیجن ماسک لاؤ۔'' پیرامیڈکس نے آکسیجن ماسک لگایا، مانیٹر جوڑا پھر اس پر چادر ڈال دی۔

''میں ساتھ جاؤں گی۔'' جزا ایمبولینس کا دروازہ بند ہونے سے پہلے قریب آئی۔

''ایمبولینس میں جگہ کی کمی ہے، آپ آگے آجائیں۔'' ڈرائیور نے کہا تھا۔

''علی تم ایمبولینس کے ساتھ جاؤ، ہم پیچھے آرہے ہیں۔''اُسکے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی رضا نے علی کو کہا تو وہ سر ہلاتے تیزی سے ایمبولینس میں بیٹھا تھا۔ جزا کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

''گاڑی میں آؤ جلدی!''مقدّم تیزی سے کہتا باہر نکلا،اُسکے پیچھے عمر اور حسین بھی باہر کی جانب بھاگے تھے تاکہ ایمبولینس کے ساتھ ہی پہنچ سکیں، وہ ایف آئی اے کی گاڑی میں آئے تھے۔ایمبولینس پورچ سے باہر نکلنے لگی۔

''جزا تم میرے ساتھ آؤ!''رضا نے اُسے کہا تو وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں باہر نکلی،ایمبولینس ریورس ہو کر گلی میں آئی اور اُسی لمحے جزا کے دروازے پر کوئی گاڑی آکر رکی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نوید کی ذاتی گاڑی تھی،ڈرائیور آگے تھا اور پیچھے سے بشریٰ باہر نکلی تھی۔ اُسے دیکھ کر جیسے جزا کی تمام حسیات بیدار ہوئیں۔ایمبولینس سائرن بجاتی، راستہ بناتی آگے بڑھ رہی تھی۔

''بھابھی؟''جزا کے منہ سے بیساختہ نکلا۔ گاڑی میں بیٹھتا حسین ٹھٹک کر رکا،اُسکی وجہ سے گاڑی رکی رہی۔ عمر اور مقدّم نے بھی پلٹ کر دیکھا تھا۔

''کیا ہوا ہے یہاں؟''بشریٰ نے نظروں سے دور ہوتی ایمبولینس کو دیکھتے ہوئے جزا سے پوچھا۔

''وہ۔۔۔وہ۔۔۔''اُسکی زبان اٹک گئی۔سب نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ صورتحال ایسی تھی کہ ان کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔

''ایمبولینس کیوں آئی تھی؟اور تم۔۔۔ تم رو رہی ہو کیا؟''بشریٰ یکدم ہی اُسکا چہرہ دیکھ کر پریشان ہوئی۔

''نہیں! میں۔۔۔میں کیوں روؤں گی؟ وہ۔۔۔پڑوس میں کسی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔''خود کو بہت مشکلوں سے قابو کرتے جھوٹ کہا۔

''اوہ! اچھا تم اندر آؤ، میں تمھارے لیے کچھ لائی ہوں۔''وہ کہتے ہوئے اندر بڑھ گئی۔ جزا نے پلٹ کر رضا کو دیکھا۔

''کیا انکو نہیں بتانا؟''اُس نے پوچھا۔

''نہیں! ابھی نہیں۔۔۔۔ تم ہسپتال جاؤ، میں کچھ دیر میں آ رہی ہوں۔'' اُس نے کہااور تیزی سے اندر بڑھ گئی۔ رضا بھی سر ہلاتا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''جزا! ڈرائیور کو کہو گاڑی اندر پارک کر دے۔'' بشریٰ کی آواز آ رہی تھی۔ نوید کی ایمبولینس محلے سے باہر نکل چکی تھی، اور بشریٰ اپنے روزمرہ کے کام نمٹا رہی تھی۔

''میں چینج کر کے آتی ہوں۔'' جزا اپنی ماں اور بشریٰ کو دیکھ کر کہتی تیزی سے اپنے کمرے میں آ کر بند ہوئی۔ پھر منہ پر ہاتھ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو دی، اُسکے لیے یہ بہت مشکل تھا۔ بہت زیادہ!

''یااللہ! میں کیا کروں؟'' روتے روتے اُسکی ہچکیاں بندھنے لگی تھیں۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل باہر نکالا اور وحید کو فون کیا۔ کچھ دیر بیل جاتی رہی، پھر فون اُٹھالیا گیا۔

''بھ۔۔۔ بھائی۔۔۔ بھائی۔۔۔'' وہ اُس سے آگے کچھ بول ہی نہ سکی۔ اُسکی ہچکیاں بندھ گئیں۔

''کیا ہوا جزا؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟'' دوسری طرف وہ پریشان ہوا۔

''بھائی!! نوید بھائی کو کارڈیک اریسٹ ہوا ہے۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔''

''کیا؟ کیسے؟ تم کہاں ہو ابھی؟ جزا بتاؤ کچھ!'' وہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہوا تھا۔ جواباً وہ سب بتاتی چلی گئی۔

''میں ہسپتال جا رہا ہوں۔'' اُس نے سب سننے کے بعد کہا۔

''نہیں بھائی! آپ یہاں آ جائیں۔ میرے پاس آ جائیں پلیز! میں کیسے بتاؤں گی امی کو، بھابھی کو۔۔۔ آپ یہاں آ جائیں پہلے۔'' اُسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کیا کہہ رہی ہے۔

''اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے! تم رونا بند کرو پہلے۔ منہ دھو جا کر۔ امی اور بشریٰ کو کچھ پتہ نہ چلے۔ میں آ رہا ہوں، میں تمہیں اپنے ساتھ ہسپتال لے جاؤں گا۔'' اُس نے اُسے سمجھایا۔ پھر فون رکھ دیا۔

وہ دروازے سے سر ٹکائے دوبارہ رو دی۔ فون ہاتھ میں تھا، رضا نے اب تک کچھ نہیں بتایا تھا۔

--------+---------+----------

''تو تمہارا کہنا ہے کہ ہم فرح کو چھوڑ دیں، اور پھر اُسکا پیچھا کر کے یہ دیکھیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔''فرّخ صاحب نے اپنے سامنے کھڑے ساگر سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ فیصل بھی ساتھ تھا۔ شیراز گھر جا چکا تھا۔ نوید کے بیٹے کا پناہ گاہ میں موجود نہ ہونا، اور نوید کی خراب حالت کی اطلاع اُنہیں بھی مل چکی تھی۔ نوید جیسے مضبوط اعصاب کے مالک شخص کے ساتھ ہونے والا واقعہ اُنکے لیے بھی باعث تکلیف تھا، پر اس وقت فرح کی جڑوں تک پہنچنا ضروری تھا۔

''پر تمہیں لگتا ہے کہ وہ اتنی کم عقل ہو گی کہ اُسے اِس بات کا اندازہ نہیں ہو گا؟ اور ہمارے لوگ اُسکا پیچھا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟''فرّخ صاحب نے پوچھا۔

''ہاں! وہ یقیناً اتنی بیوقوف نہیں ہے۔ پر ہم اُسکا پیچھا نہیں کریں گے۔''ساگر کہتے ہوئے اسکرین کی جانب آیا۔

''یعنی؟''

''میں نے ایس ایس پی ثناء سے بات کی ہے۔ فرح بے ہوش تھی، اِس دوران ہم نے اُسکے بازو میں میکرو ٹریکر انجیکٹ کر دیا ہے۔ اسے اس بات کا اندازہ نہیں ہے اور نہ ہو گا۔ اسکے ذریعے ہم اُسکی لوکیشن دیکھتے رہیں گے۔ اس طرح ہم اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں، جہاں اس نے ولید کو رکھا ہوا ہے۔''

''ٹریکر اُسکے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔''فیصل نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے، کل یا پرسوں تک ہم اس تک پہنچ چکے ہوں گے۔ پھر ٹریکر بھی نکال دیں گے۔''ساگر نے کہا۔

''ٹھیک ہے، اسے رہا کر دو۔ پر ہر حال میں اِسکا پیچھا کرنے کے لیے پھر بھی دو اہلکار روانہ کرو۔ ہم فقط ایک منی ٹریکر پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔''فرّخ صاحب نے کہا۔

''رضا واپس آ جائے، تو ہم اُس سے فرح کی دوسری شناخت کے بارے میں بھی معلومات لیں گے۔''ساگر نے کہا۔

''اُس سے کیا فائدہ ہو گا؟''فیصل نے پوچھا۔

''ہمیں اُسکی دوسری شناخت پر موجود ڈیٹا سے کوئی نہ کوئی معلومات مل سکتی ہے۔ فلحال میں ہسپتال جا رہا ہوں۔'' فرّخ صاحب نے گفتگو سمیٹی تو باقی سب بھی وہاں سے باہر نکل گئے۔

اب وقت تھا فرح کو رہا کرنے کا۔

----------+---------+--------

''نوید! نوید تم فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟'' بشریٰ کل رات سے پریشان تھی۔ اُسکی نوید سے کسی قسم کی کوئی بات نہ ہوئی تھی، اور نہ ہی اُس نے بشریٰ کے میسج دیکھے تھے۔ وہ خوفزدہ تھی، دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ نہ کسی کام میں دل لگ رہا تھا، نہ سکون آ رہا تھا۔ نجانے وہ کس حال میں ہو گا؟ اُسکا آپریشن کیسا جا رہا ہو گا؟ کوئی مسئلہ نہ ہوا اُسکے ساتھ۔ عجیب عجیب سے وہمے ستا رہے تھے۔

''واپس آ جاؤ نوید! پلیز! میرا دم گھٹ رہا ہے۔ دل بند ہو رہا ہے۔'' وہ گھبرا کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اُسکی طبیعت شاید پھر خراب ہو رہی تھی۔ پر آج نوید نہیں تھا، نہ اُسکے کسی پیغام کا جواب دے رہا تھا۔ نہ اُسکے فون اُٹھا رہا تھا۔

اور نوید کے بغیر اُسکی زندگی بالکل خالی تھی۔

--------+---------+----------

ہسپتال کی راہداری خاموش تھی، تمام نگاہیں کمرے کے دروازے پر جمی تھیں۔ جس میں موجود وجود اُنکو بہت عزیز تھا۔

سب چپ تھے۔۔۔ کسی پتھر کے مجسمے کی طرح خاموش۔۔۔

راہداری کے اختتام پر بنی کھڑکی کے پاس رضا سر جھکائے کھڑا تھا۔ علی اُسکے برابر میں تھا۔

''کیا تم خود کو قصوروار ٹھہرا رہے ہو؟'' آہستگی سے اُس سے سوال کیا تو اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔

''میں ہوں!'' اُس نے خود اذیتی سے کہا۔

''نہیں! تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔'' علی کا لہجہ نرم تھا۔

''ہے! میں نے ہی اُسے لے جانے کا حکم دے رکھا تھا۔'' وہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

''رضا!'' علی نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے اسے پکارا، اس پکار میں دوستی تھی۔ اپنائیت تھی۔

''تم نے اچھی نیت سے کیا تھا۔ تم خود کو الزام مت دو۔''

''تم نے اُسکی حالت دیکھی تھی؟ وہ کتنی بے قراری سے آیا تھا پناہ گاہ۔ اسے امید تھی کہ ولید وہیں ہوگا۔ اور اُسکی غیر موجودگی اُس سے برداشت نہ ہو سکی۔'' وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ علی کا ہاتھ اب بھی اُسکے کندھے پر تھا۔

''وہ ٹھیک ہو جائیگا۔'' علی کے پاس تسلی کے لیے الفاظ کم پڑنے لگے۔

''ہو جائیگا، پر اُسکی حالت نہیں دیکھی جا رہی مجھ سے، وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔'' رضا نے اُسے دیکھتے ہوئے دکھ سے کہا۔

''کر لے گا، وہ گولیاں کھا کر بھی ہمیشہ واپس آ جاتا ہے۔ وہ اس بار بھی ٹھیک ہو جائیگا۔'' اُس نے اُسکا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے تھوڑی دور کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر باہر آیا۔ اُن دونوں نے ہی اسے دیکھا تھا۔

----------+---------+--------

صبح کی نیلی روشنی سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ رنگا رنگ پھلوں سے سجا باغ صبح کی روشنی میں جنت لگ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں، اور سامنے بہتے دریا میں گرتی بارش کی بوندیں۔۔۔ منظر تھا کہ دل میں اترتا جا رہا تھا۔ بشریٰ وہیں گھاس پر ایک درخت سے ٹیک لگائے پر سکون بیٹھی سی تھی۔ دریا اُسکے سامنے تھا۔ بوندوں کی ٹپ ٹپ آواز بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ نوید قریب کھڑا اُسکے لیے پھول چن رہا تھا۔ ساتھ اُسکا معصوم سا بیٹا بھی تھا۔ نوید نے اُسے دیکھا، وہ شاید تین سال کا تھا۔ پر اُسکا قد اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں لمبا تھا۔ اُسکا چہرہ بالکل معید جیسا تھا۔ جیسے اُسی کا جڑواں ہو۔

پر نہیں! فرق تھا۔

معید کا چہرہ مکمل نوید جیسا تھا۔

لیکن اس بچے کا چہرہ نوید جیسا اور آنکھیں بشریٰ جیسی تھیں۔ بڑی بڑی سی، مہربان غلافی آنکھیں۔ وہ معید نہیں تھا تو کون تھا؟

''یہ لو! نوید نے ایک چھوٹا سا پھول توڑ کر اُسے دیا، پھر دور درخت سے ٹیک لگائے بیٹھی، پر سکون سی بشریٰ کو دیکھا۔

''یہ اپنی مما کو دے دو۔''اس نے کہا۔ بچے نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے وہ پھول تھام لیا۔ پھر بشریٰ کی طرف دوڑا۔

مما! مما!'' وہ چھوٹا معصوم سا بچہ، اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے اُسکے پاس آیا تو وہ مسکرائی۔

''میرے دل کے ٹکڑے!''اُس نے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا۔

''مما!'' وہ اُسے چھوٹا سا پھول دینے لگا۔ اُس نے ہنستے ہوئے تھام لیا۔

وہ ہنس رہی تھی، بہت زور سے۔۔۔ نوید اُنہیں دیکھ رہا تھا، مسکراتے ہوئے۔ آنکھیں نم سی تھیں۔

اور اسی لمحے اُسکی آنکھیں کھلی۔

وہ یک ٹک چھت کو دیکھنے لگا۔ ہر طرف سفیدی سی سفیدی تھی۔ دواؤں کی بو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر، اور دیگر عملہ اُسکے آس پاس تھے۔ ڈاکٹر اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ لیکن وہ پتھر کی طرح ساکت تھا۔ نہ آنکھیں ہلی، نہ لب۔۔۔

اسکے دوست، گھر والے اور نجانے کون کون باہر اُسکے ہوش میں آنے کے انتظار میں تھا؟ پر اُسے کسی کی کوئی پرواہ تھی نہ اطلاع۔۔۔

یاد تھا تو بس یہ کہ اسکا بیٹا اُسکے سامنے تھا۔ اُسکی نظروں کے قریب۔۔۔

وہ کتنی ہی بار پناہ گاہ آیا تھا؟ برابر میں ہی اُسکی ماں رہتی تھی، وہیں اُسکی بہن روز جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی۔۔۔ پھر بھی وہ انجان رہا۔

اسکا بیٹا ایک بار پھر اُسکی نظروں کے سامنے سے چلا گیا اور وہ کچھ نہ کر سکا۔ ولید۔۔۔ اُسکا بیٹا۔۔۔ اُسکا جگر گوشہ۔۔۔

کیسا دکھتا ہو گا وہ؟ کیا نوید جیسا؟ یا بشریٰ کے جیسا؟ یا اُسکے خواب میں نظر آنے والے بچے جیسا؟

قد میں تو یقیناً لمبا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے مرحوم بھائی معید جیسا ہو؟ اس نے پہلی بار چلنا سیکھا ہو گا تو کیسے ہنسا ہو گا؟ جب پہلا لفظ بولا ہو گا تو کیا کہا ہو گا؟

چھت کو گھورتی آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ کر بہہ نکلا، پھر اُسکی کلموں سے ہوتے بالوں میں جذب ہو گیا۔

''نوید!'' پاس کھڑے وحید سے اسکا آنسو مخفی نہ رہ سکا۔ فوراً اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے مخاطب کیا، تو پہلی بار اُس نے فقط نظروں کا زاویہ موڑ کر اُسے دیکھا۔ اُسے اب وحید کی موجودگی کا ادراک ہوا تھا۔ اُسکے پیچھے کھڑی، متورم آنکھوں سے اُسے دیکھتی جزا بھی نظر آ گئی۔ امی نہیں تھیں، بشریٰ بھی نہیں تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے نوید؟'' وحید نے نرمی سے پوچھا۔ اُس نے جواب نہ دیا۔ بس خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو ہلانے میں درد ہو رہا تھا۔ جسم میں پہلی بار شدید کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔

''حالت بہتر ہے انکی اب۔ لیکن فلحال یہ کچھ گھنٹے ہماری نگرانی میں رہیں گے۔ انکا دائیں ہاتھ اکڑنے کی وجہ سے انگلیاں سیدھی ہونے میں کچھ دقت ہو گی، لیکن پریشانی کی بات نہیں ہے۔ دن میں دو تین بار ہاتھوں کا مساج کرنے سے جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔ انکی ڈائیٹ میں نے۔۔۔'' ڈاکٹر ہدایت پر ہدایت دے رہا تھا۔

''یعنی! ہم اسے صبح تک گھر لے جا سکتے ہیں؟'' وحید نے پوچھا۔

''صبح تک کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کچھ گھنٹے انکا بی پی وغیرہ کنٹرول رہا تو آپ لے جا سکتے ہیں انہیں۔ البتہ ابھی مکمل آرام کی ضرورت ہے۔''

''شکریہ آپکا بہت!'' وحید نے کہا، ڈاکٹر سر ہلاتا باہر چلا گیا۔ اُسکے جانے کے بعد وہ اُسکے قریب آیا، اور اسکا خود کار پلنگ تھوڑا اونچا کیا۔

''کیا ہو گیا ہے نوید تمہیں؟ تم کب سے اتنے کمزور ہو گئے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''گھر جاؤ جزا! میں بہتر ہوں اب۔'' اُس نے وحید کو نظر انداز کرتے پیچھے کھڑی جزا کو دیکھتے کہا۔ وحید نے سر جھٹکا، یہ پہلی بات تھی جو اُس نے کی تھی۔

''بھائی!'' وہ اُسکے قریب آئی۔

''مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپکو بہت تکلیف پہنچائی ہے۔'' اُس نے نوید کا ہاتھ تھامتے کہا۔

''میں کم عمر تھی، نادان تھی۔ زبان پر قابو رکھنا نہیں جانتی تھی، جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ میں نے آپکا دل بہت دکھایا ہے۔ معاف کر دیں مجھے!'' وہ پھر رو دی۔

''تمہارا خط پہنچا دیا تھا میں نے اسے، تمہیں معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جواب وحید نے دیا تھا۔ اُس نے آنسو بھری نگاہیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''میں نے ہی نوید کو تمہارا بھیجا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ صرف میں ہی نہیں، بلکہ نوید بھی یہ بات جان لے کہ غلطی ہم سب کی تھی۔'' وحید نے اُسکے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ پر اُسکی تسلی نہ ہوئی۔ وہ معافی کے الفاظ نوید کے منہ سے سننا چاہتی تھی، لہٰذا روتی آنکھوں سے ایک بار پھر نوید کو دیکھا۔

''بھائی میں۔۔۔'' اس نے پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

''ولید کیسا دکھتا تھا جزا؟'' نوید نے درمیان میں پوچھا تو وہ رکی۔

''میرے جیسا ہے کیا؟'' اُسکے لہجے میں پہلی بار تڑپ اور حسرت تھی۔ وحید اور جزا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر اُسے۔۔۔

''ہاں! وہ آپکے جیسا ہے۔ مجھے میرا نام لیکر پکارتا ہے۔ جزا کہتا ہے۔۔۔'' بولتے بولتے اُسکی آواز رندھنے لگی، اور نوید کی آنکھیں جلنے لگی۔

''تم نے اُسے گود میں لیا تھا کبھی؟'' اُس نے پوچھا۔ وحید نے گہرا سانس بھر کر خود کو جذباتی ہونے سے باز رکھا۔

''ہاں! میں نے اسے گود میں لیا ہے، اُسے گود میں سلایا بھی ہے۔ وہ بہت پیارا ہے بھائی۔ بہت خوبصورت! بس میں۔۔۔ میں اُسے پہچان نہ سکی کبھی۔'' ایک بار پھر اُسکی ہچکیاں بندھنے لگی۔

''کیا تم نے اُسے پیار کیا ہے جزا؟'' اُس نے پھر پوچھا، اس بار وحید کی ہمت جواب دے گئی۔

''مت کرو نوید!'' اُسکا کندھا دباتے التجا کی۔ ''مت کرو! تمہیں تکلیف ہو گی ایسے۔۔۔''

''کیا تم نے اُسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا ہے کبھی؟'' وہ سن ہی نہ رہا تھا جیسا۔

''بھائی!۔۔۔'' جزا کے الفاظ اُسکی ہچکیوں کی نذر ہونے لگے۔

''اُسکی آواز کیسی تھی؟ وہ بولتے ہوئے کیسا لگتا تھا؟'' جزا سے مزید برداشت نہ ہوا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی تیزی سی باہر نکل گئی۔

''نوید پلیز!'' وحید نے میں ایک بار پھر التجائیہ انداز میں کہا۔ اُسکا بیٹا زندہ تھا۔ پر اُسکے پاس نہ تھا، اور اب اُس عورت کے پاس تھا، جس نے اُسکے ایک بیٹے کو زندہ جلایا تھا اور ایک بیٹے کو زندہ رکھ لیا، صرف اپنی زندگی کی ضمانت کے لیے۔

''چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے، کچھ بھی۔۔۔ پر میں ولید کو واپس لاؤں گا۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا اس عورت کو۔'' وحید نے اُسے تسلی دیتے کہا۔

''اُس نے ولید کو کہاں رکھا ہو گا؟'' اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

''جب تم بے ہوش تھے، تب فرّخ صاحب سے بات ہوئی تھی میری۔ وہ رضا سے معلومات لیں گے، سا گر اس عورت کی دوسری شناخت پر موجود ڈیٹا نکلوانا چاہتا ہے۔ جلد ہی ہم ولید تک پہنچ جائیں گے۔''

''کیا وہ واقعی میرا بیٹا ہے؟'' اُس نے عجیب سا سوال کیا۔

''صبح تک ڈی این اے رپورٹ آجائے گی۔ سب پتہ چل جائیگا صبح تک۔'' اُس نے کہا۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔

''اگر وہ جھوٹ بول رہی ہو تو؟ اگر میرا بیٹا اُسکے پاس نہ ہوا تو؟'' اُسکی آنکھوں میں کوئی خوف آسمایا تھا۔ وحید کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''تم پریشان نہ ہو نوید! ہو سکتا ہے یہ تمہاری آخری آزمائش ہو۔'' اُس نے کہا۔

''تمہارے دوست تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں باہر جا رہا ہوں تاکہ اُنہیں اطلاع دے سکوں۔ جزا کو بھی گھر چھوڑ دوں، پھر واپس یہیں آؤں گا۔ بشریٰ اور امی کو بس اتنا کہا ہے کہ اُسے کسی کام سے لیکر جا رہا ہوں۔'' اُس نے کہا تو نوید نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ باہر چلا گیا تو اس نے نگاہیں دوبارہ چھت پر ٹکا دیں۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا اور باقی سب اندر آتے دکھائی دیے۔ اُس نے نظریں آنے والوں پر کیں۔ وہ پریشان چہروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ بات کرنے کے لیے الفاظ نہ تھے۔

نوید کا چہرہ چند گھنٹوں میں ہی نقاہت زدہ سا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے، اور چہرے پر جھریاں محسوس ہونے لگی تھیں۔ وہ ایک ہی رات میں ڈھے گیا تھا جیسے۔ کندھے ڈھلکے ہوئے تھے اور چہرہ ویران تھا۔

سیکنڈ منٹوں میں تبدیل ہونے لگے پر کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔کچھ بھی نہ۔۔۔۔

''نوید!''رضانے سب سے پہلے لب کھولے،پر کچھ کہہ نہ سکا۔

''تم سب کو گھر جانا چاہیے۔''نوید نے اُسکے کچھ بھی کہنے سے پہلے کہا۔جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔

''تم ہسپتال سے ڈسچارج ہو جاؤ۔ پھر چلے جائیں گے۔''علی نے کہا۔وہ جواباًچپ رہا،وہاں پھر خاموشی چھاگئی۔خاموشی کا یہ دورہ طویل ہونے لگا۔ڈھیروں مکالمے بولنے والا حسین بھی کچھ کہنے سے قاصر تھا۔

خاموشی چبھنے لگی۔۔۔ایک عجیب سی الجھن سب کو ہونے لگی۔۔۔

''میں کچھ دیر آرام کرناچاہتاہوں۔''بلآخر نوید نے بے تاثر لہجے میں کہا۔وہ اکیلے رہناچاہتا تھایقیناً۔

''ٹھیک ہے تم آرام کرو۔ ہم باہر ہی ہیں۔''مقدّم نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔پھر وہ سب جیسے آئے تھے،ویسے ہی باہر نکل گئے۔سوائے رضا کے۔وہ نہیں گیا،وہ وہیں کھڑا نوید نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ولید پناہ گاہ میں آنے والا اب تک کا سب سے کم عمر بچہ ہے۔''رضا کی آہستہ آواز کمرے میں گونجی تو وہ کچھ حیران ہوا۔سب جا چکے تھے،بس وہ دونوں باقی رہ گئے تھے۔۔

''مجھے بہت پیارا ابھی ہے۔میرے سامنے اُس نے بیٹھنا سیکھا،چلنا سیکھا،بولنا سیکھا۔شاید اس لیے بھی زیادہ پیارا ہے۔''نوید نے نظریں اُس سے ہٹالیں۔چہرہ فرش کی جانب مرکوز کر دیا،نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُسکے چہرے کے تاثرات دیکھے۔

''پر میں اُسکی حفاظت نہ کر سکا۔مجھے معاف کر دو،میں اُسکی حفاظت نہیں کر سکا۔میں اپنے بیٹے کی۔۔ تمہارے بیٹے کی حفاظت نہیں کر سکا۔''رضانے سر جھکائے شرمندگی سے کہا تھا۔

''میں بھی نہیں کر سکا۔''اُس نے ہلکے سے کہا تو رضا نے کرب سے آنکھیں میچیں۔

''میں تم سے شرمندہ ہوں نوید!''

''تمہارا قصور نہیں ہے۔''اُس نے کہا۔

''میں نے ہی یہ حکم دیا تھا کہ میرے پیچھے فریحہ جب چاہے، ولید کو لے جا سکتی ہے۔''

''تم نہ بھی کہتے تب بھی وہ اُسے لے جاتی۔'' نوید اُسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یہ وہ دو لوگ تھے۔۔۔

جن کے پاس کہنے کے لیے الفاظ ہمیشہ کم ہوتے تھے۔۔۔

اور جنہیں اظہار کرنا سچ میں نہیں آتا تھا۔۔۔

یہ وہ دو لوگ تھے جن کی زندگی دو مشترکہ محبتوں سے جڑی ہوئی تھیں۔۔۔

ایک ولید۔۔۔اور دوسری جزا۔۔۔

قسمت نے بھی بڑے عجیب طریقے سے اُنہیں جوڑا تھا۔۔۔۔

''مجھ سے جو ہو سکا، وہ میں ولید کو واپس لانے کے لیے کروں گا۔'' رضا نے پھر کہا۔ اُسے شاید سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کیسے تسلی دے؟

''میں پہلے ہی تمہارا مقروض ہوں۔'' اُسکی نگاہیں ابھی بھی فرش پر تھیں۔ لیکن اس بار لہجے میں تشکر تھا، عاجزی تھی۔ اس بات پر رضا نے رک کر اُسے بغور دیکھا۔ پھر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ نوید نے چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔

''بھائی ہو تم میرے۔۔۔'' اُس نے وہ کہا جو کہنے میں اسے مدت لگ گئی۔

''اور بھائیوں کے درمیان کچھ بھی قرض نہیں ہوتا۔'' اُس کے الفاظ شاید مرہم کا کام کر گئے تھے۔ نوید نے آنکھوں میں امڈتے آنسو ایک بار پھر رخ پھیر کر چھپا لیے۔ اُسے شاید واپسی کی منزل تک آنے میں اب بھی وقت درکار تھا۔

''رضا!'' دونوں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے پر حسین تھا۔

''شیراز باہر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''آ رہا ہوں!'' اُس نے سر ہلاتے جواب دیا۔ پھر نوید کو دیکھا۔

''کوئی اطلاع ملی تو فوراً تمہیں آگاہ کروں گا۔''اُس نے کہااور باہر نکل گیا۔ حسین نے رک کر کچھ دیر نوید کو دیکھا، جس پر ایک ہی رات میں عمریں گزر گئی تھیں۔ وہ زخم خوردہ شیر بن چکا تھا۔

اور زخمی شیر زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

--------+---------+----------

''کیا تم لوگ ہمیشہ سے ایسے ہی ہو؟'' راہداری میں فرّخ صاحب کی آواز پر رضا نے مڑ کر دیکھا۔ وہ سب سے مخاطب تھے۔

''ایسے یعنی؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''یعنی آج تیسری بار نوید ہسپتال میں ایڈمٹ ہے، اور تم لوگ یہاں سے جانے کو تیار نہیں ہو۔''اُنہوں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

''پر آج آپ نے یہ نہیں کہا کہ وہ ٹھیک ہے، اُسے کچھ نہیں ہوا۔'' حسین اُداسی سے مسکرایا۔

''آج میں کہہ بھی نہیں سکتا۔ آج وہ واقعی ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ رنجیدہ تھے۔ ''اگر آج میں اُسکے بیٹے کو لانے میں کامیاب نہ ہو سکا تو شاید نوید ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیگا۔ اس بار ہم اُسے کھو دیں گے۔''اُنکا لہجہ پہلی بار افسردہ تھا۔

''ایسا نہیں ہو گا۔ ہم ڈھونڈ لیں گے ولید کو۔'' رضا نے کہا۔

''ہاں! مجھے آپ سے فرح عرف فریحہ کے متعلق معلومات لینی ہیں۔ کیا اُسکا کوئی پتہ ہے آپکے پاس؟'' شیراز نے اُسکے قریب آکر سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں! میرے پاس اُسکے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی ہے۔ اُس پر اُسکا نام فریحہ ہی درج ہے۔ رہی بات گھر کی تو میں نے کئی مرتبہ اُس سے گھر کے بارے میں پوچھا کہ شاید مجھے کبھی ولید کو چھوڑنے یا لینے کے لیے ضرورت در پیش آجائے، پر اُس نے ہمیشہ ٹال دیا۔ میں نے بھی بار بار پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔''اُس نے تفصیلاً بتایا۔

''کیا آپ فوری طور پر اُسکا شناختی کارڈ دکھا سکتے ہیں۔'' شیراز نے پوچھا۔

''میں عائشہ جی سے کہتا ہوں کہ وہ میرے لیپ ٹاپ سے ڈیٹا نکال کر بھیج دیں۔ کچھ وقت لگے گا اس میں۔'' رضا نے کہا۔

''میں انتظار کر لوں گا۔'' وہ سنجیدگی سے کہتا ایک طرف ہو گیا۔ رضا نے چند لمحے بغور اُسے دیکھا۔ وہ اُسے زیادہ نہیں جانتا تھا، پر جب بھی ملا تھا، اُسے ہمیشہ ہنستے مسکراتے دیکھا تھا۔ پر آج وہ اتنا سنجیدہ تھا، جتنا نوید رہتا تھا۔ وہ سر جھٹک کر فون پر کچھ لکھنے لگا۔

''ہم آج رات فریحہ کو چھوڑ دیں گے۔'' راہداری میں فرّخ صاحب کی آواز گزری۔ سب نے حیرت سے انھیں دیکھا۔

''کیوں؟'' وحید اُسی لمحے وہاں آیا تھا۔

''کیونکہ ہم اُسکی جڑوں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو ہم کل تک اصل مجرموں تک پہنچ جائیں گے۔'' اُنہوں نے کہا۔

''ایک بات مجھے سمجھ نہیں آئی۔'' حسین نے اُنہیں سنجیدگی سے دیکھا۔

''کونسی بات؟'' اُنہوں نے رک کر پوچھا۔

''آپ کے لوگوں نے پچھلے کئی ماہ ہماری نگرانی کی ہے۔ یقیناً! رضا کی بھی کی ہو گی۔ تو کیا انہوں نے فریحہ کو وہاں آتے نہیں دیکھا؟ اگر دیکھا تک آپکو اطلاع کیوں نہ پہنچی۔'' سوال معقول تھا۔

''کیونکہ فرح کا کیس کوئی ہائی پروفائل کیس نہ تھا، جسے سب جانتے۔ ایف ای اے دن میں سینکڑوں ایسے کیسز پر کام کرتی ہے، ہر کیس الگ ٹیم کے حوالے ہوتا ہے۔ ہر کسی نے ہر کیس کے ملزم کو نہیں دیکھا ہوتا۔ اور فرح کو میرے اور نوید کے علاوہ سب نہیں جانتے تھے۔ خصوصاً وہ ملازمن جو تم لوگوں کی نگرانی پر مامور تھے۔ نہ وہ فرح کو جانتے تھے، نہ انہوں نے اسے کبھی دیکھ رکھا تھا۔ وہ فقط تمہاری نگرانی کے لیے وہاں تھے، ہاں! اگر ہم نے فرح کی تصویر دکھا کر اُنہیں ہدایت دی ہوتی کہ اِس کی خبر رکھیں، تو یقیناً وہ بتاتے۔ پر ہم نے ایسا کچھ کیا ہی نہیں، نہ ہمارے گمانوں میں تھا کہ وہ تمہارے گھر آتی ہو گی۔'' اُنہوں نے بتایا۔

''اوہ! اگر معلوم ہوتا تو یہ معاملہ پہلے حل ہو جاتا۔'' رضا نے افسوس سے کہا۔

''کیا تم لوگ واقعی گھر نہیں جاؤ گے؟'' فرخ صاحب نے یکدم ہی پوچھا۔

''کیا ہم جا سکتے ہیں؟'' عمر نے الٹا سوال کیا تو وہ مسکرائے۔

''ٹھیک ہے! جیسے چاہو۔'' اُنہوں نے کندھے اُچکاتے کہا۔

''نوید کو ڈاکٹر ڈسچارج کر رہے ہیں۔ پر وہ فلحال گھر نہیں جانا چاہتا۔''وحید نے سنجید گی سے اُنہیں بتایا۔

''جس گھر میں وہ رکے ہیں، تم اُسی گھر میں اُسے لے جاؤ۔''انھوں نے جواب دیا۔اتنی دیر میں رضا نے تمام تفصیلات شیراز کے حوالے کر دی تھیں۔

''اس نے بھی وہیں جانے کا کہا ہے، پر مجھے اُسکی فکر ہے، وہاں اُسکا خیال کون رکھے گا؟''وحید نے فکر مندی ظاہر کی۔

''ہم ہیں اُسکے ساتھ وہاں۔'' حسین نے نرمی سے کہا، تو وحید نے اُسے دیکھا۔ پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

--------+---------+----------

کمرے میں خاموشی تھی۔ کل رات ٹھیک ٹھاک بارش ہوئی تھی۔ کراچی میں بارش ہو جائے تو موسم حسین تر ہو جاتا ہے، ہر شے اپنے جوبن پر اُتر آتی ہے۔ آج بھی صبح سے موسم ابر آلود تھا، فضا ٹھنڈی اور رم جھم مستقل برس رہی تھی۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے، یک ٹک سامنے شیشے پر برستی بارش کی بوندوں کو دیکھ رہا تھا۔ رات ہسپتال سے یہاں آیا تو دواؤں کے زیرِ اثر سو گیا تھا۔ اب جاگا تو ہر جانب خاموشی تھی۔ جاگنے کے بعد اُس نے موبائل دیکھا تو بشریٰ کے لاتعداد پیغامات اور ڈھیروں مس کالز تھیں۔ اُس نے پیغامات کھولے اور ایک ایک کر کے پڑھنا شروع کیے۔

''کہاں ہو نوید؟''

''فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟''

''تم کب آؤ گے؟ پلیز! جلدی آ جاؤ۔''آخری پیغام تھا۔ اُسکا دل تڑپ اٹھا۔ پرسوں رات سے وہ اُسے ٹھیک ٹھاک نظر انداز کر چکا تھا۔ فوراً اُسے فون کیا۔ سیکنڈ مکمل ہونے سے بھی قبل فون اُٹھا لیا گیا۔ اُسکے لبوں پر اُداسی سی رینگی۔ وہ موبائل ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی شاید!

''نوید کہاں ہو تم؟''اُسکی پریشان کن آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپریشن کے آخری لمحات تھے، اس لیے تم سے بالکل بات نہیں ہو پائی۔ جلد ہی گھر آ جاؤں گا۔''اُس نے آہستگی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں! تم تو ٹھیک ہو نا؟ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔'' اُس نے پوچھا، آواز پہلے سے قدرے مطمئن تھی۔

''ہاں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم بتاؤ کیسی ہو؟'' اُس نے لہجے میں بشاشت سمونے کی ناکام کوشش کی۔

''میں ٹھیک ہوں بس!۔۔۔'' وہ رکی۔

''کیا ہوا؟'' نوید نے پوچھا۔

''بس! تم جلدی آجاؤ۔'' اُس نے کہا۔

''پریشان نہ ہو جلد آؤنگا۔'' اُس نے کہا، پھر پوچھا: ''اور بتاؤ، کیا کر رہی تھی تم؟''

''کچھ خاص نہیں، آج۔۔۔'' وہ بتانے لگی، اور اُسے سنتے نوید کا ذہن بھٹکنے لگا۔ نجانے فرح کا کیا ہوا؟ ولید مل سکے گا یا نہیں؟ ان سب باتوں کے جواب اُسکے پاس نہ تھے۔ وہ اب کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

کن من برستی بارش اُسکے دل کی اداسی کم کرنے میں ناکام تھی۔ اُسی لمحے دروازہ پر دستک ہوئی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو ادھ کھلے دروازے پر علی کھڑا تھا۔ ہاتھوں میں ٹرے موجود تھی۔

''آجاؤ!'' اُس نے کہا تو وہ اندر آیا۔

''میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔ خیال رکھنا!'' نوید نے بشریٰ سے کہا اور پھر کال کاٹ دی۔ علی نے بستر پر جگہ بنا کر ٹرے اُسکے سامنے رکھی۔ دو عدد سینڈوچ، ایک چائے کی پیالی اور ساتھ دوائیں رکھی تھیں۔

''شکریہ! پر میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں۔'' اُس نے آہستگی سے کہا تو علی نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔

''کیا تم نے بالکل ہی ہمیں اپنی زندگی سے نکال دیا ہے؟ کیا ذرا سی بھی گنجائش نہیں بنتی؟'' اُس نے نوید کے رویے پر آج چپ توڑنا ضروری سمجھا تھا۔ اس طرح وہ اکیلے ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا۔

''باقی سب کہاں ہے؟ گھر کیوں نہیں گئے؟'' اُس نے وہی کیا جو وہ ہمیشہ سے کرتا آیا تھا۔ علی کو آج سمجھ آیا کہ یہ اپنا من پسند جواب دینے یا نظر انداز کرنے والی عادت نہیں تھی، یہ فرار تھا۔

''باہر ہی ہیں سب، جانا نہیں چاہتے۔ تمہاری کل جو حالت تھی۔ اُسکے بعد تمہیں چھوڑ کر سکون سے نہیں رہ سکتے تھے۔''اُس نے کہا۔

''ضرورت نہیں تھی اِسکی!''نوید نے جواب دیا۔

''ہر چیز ضرورت کے تحت نہیں کی جاتی نوید!''علی نے آہستگی سے کہا۔

''تمہیں ہماری ضرورت نہیں ہو گی، پر ہم تمہیں اس طرح اکیلے نہیں چھوڑ سکتے۔''اُس نے پھر کہا۔ نوید نے اِس بار بھی کوئی جواب نہ دیا تو وہ جانے کے لیے مڑا۔

''جب میرے بیٹے مرے تھے، تب تم میرے پاس نہیں تھے۔ مجھے اب کچھ نہیں چاہیے۔ ضرورت بھی نہیں! دوستی بھی نہیں!''اُس کی ٹھوس آواز پر علی پلٹا اور واپس اُسکے پاس آیا۔

''کیا تم اس بات کا بدلہ تاعمر لو گے؟''اُس نے پوچھا۔

''دوستی تم نے ختم کی تھی۔ گھر سے تم نے نکلنے کو کہا تھا۔''اُس نے یکدم ہی کہا۔

''میں غلط تھا۔ ناراض تھا، مان جاتا کچھ دنوں میں۔''اُس نے وضاحت دی۔

''میں اسی شہر میں تھا۔ دس سالوں میں بھی تم نہ مانے، تو پھر کیا اُمید رکھتا تم سے؟''اُس نے پہلی بار شکوہ کیا۔ علی کے پاس وضاحتیں کم پڑنے لگیں۔ اُس نے سر جھکایا۔

''میں سمجھ گیا۔''پھر چہرہ اُٹھا کر اُداسی سے مسکراتے کہا۔

''کیا؟''نوید نے پوچھا۔

''یہی کہ میں نے اپنا دوست کھو دیا ہے۔''اُس نے کہا۔ اُسی لمحے دروازے پر ایک مرتبہ پھر دستک ہوئی۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ وحید سامنے کھڑا تھا۔ اُسکے ہاتھ میں کوئی میڈیکل رپورٹ تھی۔ علی جانتا تھا وہ کیا ہے۔

''بھائی!''نوید کو اُسکے یہاں آنے کی توقع نہ تھی۔

''کیسے ہو نوید؟'' وہ اُسکے قریب آیا، تو علی خاموشی سے نکل گیا۔ نوید نے اُسے کچھ نہ کہا۔

''طبیعت کیسی ہے اب؟'' وحید نے پوچھا۔

''کیسی ہو گی؟'' سوال عجیب سا تھا۔ وحید چند لمحوں اُسے دیکھتا رہا۔ پھر ڈی این اے رپورٹ اُسکے سامنے رکھی۔

''وہ ولید ہی ہے، ہمارا ولید!'' اُس نے آہستہ سے کہا، نوید کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ آئی۔ جیسے وہ جانتا تھا، یہی ہو گا۔ پھر اس نے گہرا سانس بھر کر چہرہ اوپر کیا، پھر دوبارہ نیچے کر لیا۔ جیسے بہت سارے آنسو اندر ہی اتارے ہوں۔

''نوید!'' وحید نے آگے بڑھ کر اُسے اپنے ساتھ لگایا۔

''کیا پتہ یہ آخری آزمائش ہو؟'' اُسکا بازو سہلاتے ایک بار پھر تسلی دی۔

''بھائی! میں آپکو بتا نہیں سکتا۔۔۔ سمجھا نہیں سکتا۔۔۔ پر میرا دل جل رہا ہے اس وقت۔'' وہ ٹوٹے سے لہجے میں کہنے لگا۔ ''میں مر رہا ہوں اندر سے۔ میرا بچہ میرے سامنے سے چلا گیا ہے۔ اُسی عورت کے پاس ہے۔ میں اپنی تکلیف بتا نہیں سکتا آپکو۔'' وہ کتنا جل رہا تھا یہ بات اُسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کل رات جو ہوا تھا اُسکے ساتھ، وہ ہی کافی تھا اُسکے دل کا حال سنانے کو۔

''میں جانتا ہوں، مجھے تمہاری ہر تکلیف معلوم ہے۔'' وحید نے اُسکا بازو سہلاتے کہا۔ ''خود کو اذیت مت دو۔ ہم آج ہی ولید کو لے آئیں گے۔'' اس بات پر نوید نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ وحید اُسکے برابر ہی بیٹھ گیا۔

''آج ہی؟'' اُسے یقین نہ آیا۔

''ہاں! ساگر کا آئیڈیا کام کر گیا ہے۔ فرح کی لوکیشن معلوم ہو گئی ہے۔ وہ کل رات سے جس جگہ ہے، اُس جگہ کو ہم گھیرے میں لے چکے ہیں۔ اُسکے علاوہ اُسکی دوسری شناخت پر مزید معلومات بھی ملی ہیں۔'' وحید نے کہا۔ ''ایک تو میری سمجھ نہیں آ رہا، اس ملک میں ایک ہی شخص کو دو شناختی کارڈ کیسے جاری ہو سکتے ہیں؟'' وہ بڑبڑایا تھا۔

''بھائی!'' نوید نے یکدم ہی اُسے پکارا تو وہ رکا۔

''ہاں! کہو!'' فوراً جواب دیا۔

''میرا بیٹا واپس آجائیگا نا؟ میں بشریٰ کو اُسکی اولاد واپس لوٹا سکوں گا؟'' اُس نے کسی خوفزدہ بچے کی طرح پوچھا تھا۔

''ہاں کیوں نہیں؟ میں لاؤں گا اُسے واپس۔ میرا وعدہ ہے تم سے۔'' اُس نے پیار سے اُسکا چہرہ تھپتھپاتے کہا۔ باہر کھڑا علی خاموش قدموں سے جانے کے لیے مڑ گیا۔

وہ اُسکا دوست تھا، وہ چاہتا تھا نوید اُس سے سب کہہ دے۔ اپنے سارے خوف، سارے خدشے۔۔۔

لیکن سب کہنے کے لیے دوست ہونا ضروری نہیں ہے۔

اپنا ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔۔۔۔

بس! دل میں مقام حاصل کرنا ضروری ہے۔۔۔۔

اور شاید ابھی وہ اس مقام پر نہیں پہنچے تھے۔۔۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ فرّخ صاحب، ساگر، فیصل اور شیراز بھی اُسکی عیادت کو پہنچے۔

''طبیعت کیسی ہے اب؟'' فرّخ صاحب نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے پوچھا۔ اُنکے چہرے پر پچھلے دنوں کی کسی بات کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔

''بہتر ہے۔'' اُس نے مختصر جواب دیا۔

''رپورٹ مل گئی تمہیں؟'' وہ اُسکے سامنے والے صوفے پر بیٹھے تھے، ساگر بھی ساتھ ہی تھا۔ وحید اُسکے برابر میں تھا، جبکہ فیصل ڈریسنگ ٹیبل سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اور شیراز؟ نوید کی نظروں نے اُسے تلاشا۔ وہ دروازے کے برابر بنے ستون سے ٹیک لگائے، سر جھکائے کھڑا تھا۔

''مل گئی ہے۔'' اُس نے چہرہ واپس موڑتے سنجیدگی سے کہا۔

''ہم آج رات اُس جگہ ریڈ کرنے جا رہے ہیں، جہاں فرح مقیم ہے۔ وہ شہر سے دور، مضافات میں موجود ایک فارم ہاؤس ہے۔ آس پاس کوئی آبادی بھی نہیں ہے۔ ہمیں ہر صورت فرح اور ولید کو آج ہی حاصل کرنا ہے۔ اُسی کے ذریعے ہم اصل مجرم تک پہنچ سکتے ہیں۔'' ساگر نے کہا۔

''آپ لوگ کب تک جائیں گے؟'' نوید نے پوچھا تو ساگر نے فرّخ صاحب کا منہ دیکھا۔

''شام میں نکلے گی ٹیم۔'' اُنہوں نے مختصر جواب دیا۔

''میں بھی جاؤں گا۔'' اُس نے پوچھا نہیں تھا، بتایا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اُنہوں نے بھی مزید کچھ نہ کہا، جانتے تھے کہ جب اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو کوئی بھی تاویل بیکار ہے۔

''ٹھیک ہے! پھر تم کچھ دیر آرام کرو۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑے ہوئے، تو ساگر بھی کھڑا ہو گیا۔ ''شام کو ٹیم کے ساتھ جانا ہے۔ اور ہاں!'' وہ رکے۔ ''رضا بھی ساتھ جائیگا۔''

''کیوں؟'' نوید سے پہلے وحید نے پوچھا۔

''ولید اُسے پہچانتا ہے، اُسکا ساتھ رہنا ضروری ہے۔ میں نے تمہارے دوستوں کو بھی فلحال گھر جانے سے منع کر دیا ہے۔ جب تک مجرم پکڑا نہیں جاتا، اُنہیں یہیں رہنا چاہیے۔ اور اب جبکہ فرح آزاد ہے تو ہم کوئی رسک بھی نہیں لے سکتے۔'' اُنہوں نے کہا۔

''میں چلتا ہوں اب۔'' وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''گیٹ ویل سون سر!'' فیصل نے اُسے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ساگر بھی اُسے نیک تمنائیں دے کر باہر نکلا۔

''شیراز!'' شیراز جانے لگا تھا، جب نوید نے اُسے پکارا۔ وہ رکا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں!'' وہ مختصر الفاظ میں، بنا کسی تاثر کے کہتا باہر چلا گیا۔ نوید کی نظروں نے دور تک اسکا پیچھا کیا تھا۔

----------+---------+--------

رات کے سات بج رہے تھے۔ سارے میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''میں امید کرتا ہوں کہ آج یہ سب ختم ہو جائیگا۔'' عمر نے کہا۔

''ان شاءاللہ!'' علی نے کہا۔

''اور اُسکے بعد؟'' یہ عجیب سا سوال مقدّم کی جانب سے آیا تھا۔ سوال عجیب تھا یا شاید وہ اِس سوال کے لیے تیار نہ تھے۔

''اُسکے بعد سب اپنے اپنے راستے۔ جیسے پہلے تھے۔۔۔'' جواب اِس سے بھی زیادہ عجیب تھا۔ لیکن انہونی یہ تھی کہ دینے والا حسین تھا۔ اس بات پر وہاں ایک جامد خاموشی چھاگئی تھی۔ سب نے نظریں چرائی تھیں۔ حسین ہمیشہ ایسے ہی کرتا تھا، کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کہ سب اپنے آپ میں سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔

''کیا ہم آج سب ختم نہیں کر سکتے؟ کیا ساری پرانی باتیں؟'' مقدّم نے سب کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''کیا ابھی بھی سب ختم نہیں ہوا؟ اُسکے لیے زبان سے کہنا ضروری ہے؟'' علی نے الٹا سوال کیا تو وہ مسکرایا۔

''ضروری ہے، بہت ضروری ہے۔'' حسین نے کہا تو سب نے اسے دیکھا۔ ''کیونکہ کچھ لوگوں کے دل ابھی بھی صاف نہیں ہوئے۔''

''اور یہ کچھ لوگ کون ہیں؟'' رضا نے پوچھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا نوید کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آیا۔ سیاہ جینز پر، ہمیشہ کی طرح سیاہ شرٹ ٹک ان کیے۔ اپنے تمام اسلحوں اور ہتھیار کے ساتھ وہ جانے کو تیار تھا۔ اُسکی بلٹ پروف جیکٹ اُسکے ہاتھوں میں تھی، دوسرے ہاتھ میں موبائل لیے، اس پر کچھ لکھتا وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ وہیں آرہا تھا۔

''کچھ لوگوں نے ہمیں زندگی سے مکمل طور پر نکال دیا ہے۔ اور ہمیں ہمارا قصور بھی نہیں بتایا۔'' حسین نے سنجیدگی سے پچھلی بات کا جواب دیا، تو نوید کے قدم رکے، اور اُس نے نظریں اٹھا کر اچھنبے سے اسے دیکھا۔ پر کہا کچھ نہیں۔

''چلو رضا! باہر شیر از انتظار کر رہا ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں رضا کو مخاطب کیا۔ اور باہر نکل گیا۔ چہرے پر نقاہت کے آثار اب بھی نظر آرہے تھے۔

''ٹھیک ہے پھر! میں چلتا ہوں۔ امید ہے واپسی پر ہم اچھی خبر کے ساتھ آئیں گے۔'' رضا نے سب کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' عمر نے کہا۔

''اور ایس ایس پی صاحب کا بھی!'' حسین نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرایا۔

''وہ اپنا خیال خود رکھ سکتا ہے۔'' یہ جواب علی نے دیا تھا۔ اُنہیں خدا حافظ کہہ کر رضا باہر آگیا۔ شیراز، فیصل اور ساگر بقیہ ٹیم کے ساتھ موجود تھے۔ نوید کا بھائی بھی موجود تھا، وہ بھی شاید ساتھ ہی جا رہا تھا۔ رضا نے اندازہ لگایا۔

''سب مکمل ہے تو اب فوراً نکلتے ہیں۔'' نوید نے کہا۔

''ٹھیک ہے!'' ساگر نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بقیہ ٹیم کو ہدایت دینے لگا۔

''تم بیٹھو! اور یہ پہن لو۔'' نوید نے ہاتھوں میں تھامی جیکٹ رضا کی جانب بڑھا دی۔

''کیا مجھے اسکی ضرورت ہے؟''

''ہاں! وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' اُس نے کہا۔ رضا نے جیکٹ لے لی۔ فیصل نے اسے پہننے میں مدد کی۔ پھر وہ جیپ میں بیٹھ گیا۔ نوید نے بھی اُسکے برابر میں نشست سنبھال لی۔

راستے بھر خاموشی تھی۔ آگے بیٹھا ساگر پل پل کی خبریں فرّخ صاحب کو دے رہا تھا۔ وحید، نوید اور رضا کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ بغور رضا کو دیکھ رہا تھا، اور وہ اُسکی نظروں سے عجیب الجھن کا شکار تھا۔ اُسکی نظریں نوید نے بھی محسوس کیں تو چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کیا ہوا ہے بھائی؟'' اُس نے وحید سے پوچھا۔

''ولید کی تصویریں دے دی ہیں تم نے ساگر کو؟'' وحید نے اسے نظرانداز کر کے رضا کو مخاطب کیا۔ اس سوال پر نوید نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ اسے تو یاد ہی نہ رہا تھا کہ رضا کے پاس ولید کی تصاویر موجود ہوں گی۔

''ہاں!'' پھر اُس نے جیب سے موبائل نکالا۔ کچھ تلاشا، پھر مطلوبہ شے مل جانے پر موبائل نوید کی جانب بڑھایا۔ نوید نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تمہارا بیٹا!''اُس نے آہستگی سے کہا تو چند لمحے نوید موبائل کو دیکھتا رہا، پھر ہاتھ بڑھا کر اُسے تھاما۔ وحید اور رضا، دونوں نے اُسکے ہاتھوں کو لمحے بھر کے لیے کانپتے دیکھا تھا۔ وہ باپ تھا۔۔۔ایک لاچار باپ۔۔۔

اُس نے موبائل لیا، اور تصاویر آگے بڑھا کر دیکھنے لگا۔ مختلف اوقات کی تصویریں تھیں۔ وہ لب بھینچے دیکھتا رہا، پھر خاموشی سے موبائل رضا کو واپس کر دیا۔ کوئی ردعمل نہ دیا۔۔۔کچھ نہ کہا۔۔۔

''تمہارا بیٹا مل جائے گا۔''رضا نے تسلی دینی چاہی۔

''پر وہ تو تمہیں باپ سمجھتا ہے۔''سوال نہایت ہی غیر متوقع تھا۔ رضا چپ کا چپ رہ گیا۔

''وہ تو فرح کو بھی اپنی ماں سمجھتا ہو گا۔''جواب اس سے بھی زیادہ غیر متوقع تھا۔ اور دینے والا وحید۔ نوید کے جبڑے تنے، پر وحید بھی اُسی کا بھائی تھا۔ اُسی کی طرح، سفاکی کی حد تک صاف گو۔

''رضا اور فرح میں فرق ہے۔''اب کہ وحید نے آہستہ سے کہا۔''اِس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ کسے کیا سمجھتا ہے؟ فرق اِس بات سے پڑتا ہے کہ وہ صحیح سلامت ہمیں مل جائے۔ پھر وہ جہاں خوش ہو۔''اُس نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو پہلی بار نوید نے نظریں اٹھا کر اسے ناراضگی سے دیکھا تھا۔ کم از کم وہ اس وقت یہ نہیں سننا چاہتا تھا۔

''وحید بھائی!''رضا نے اسے مخاطب کیا۔ پہلی بار۔۔۔اسے بھائی ہی مناسب لگا، تو وہ ہی کہا۔

''میں نے اپنے گھر میں ہر بچے کو اسی امید کے ساتھ پالا ہے کہ ایک روز وہ یہاں سے چلے جائیں گے۔ اور یہ دعا ہر وقت کی ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے پاس واپس چلے جائیں۔ اگر ایک بچہ بھی اپنے اصل گھر واپس لوٹ جاتا ہے، تو وہ میری سب سے بڑی خوشی ہے۔ کیونکہ بچے کو اصل محبت اُسکے اپنے ماں باپ ہی دے سکتے ہیں۔''اُس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تمہیں تکلیف نہیں ہو گی؟ تم تین سال سے اُسے پال رہے ہو۔''وحید نے اس سے پوچھا۔

''میری تکلیف ثانوی ہے، اس تکلیف کے مقابلے میں جو اُسکے ماں باپ پچھلے تین سال سے سہہ رہے ہیں۔''اُس نے کہا۔ پہلی بار وحید مسکرایا، تشکر آمیز تاثرات کے ساتھ۔ وہ بھی نوید کی طرح کم مسکراتا تھا، پر محسور کن۔۔۔یا شاید، یہ تینوں بہن بھائی ہی ایسے تھے۔

''ہم پہنچ گئے ہیں۔''ساگر کی آواز پر اُنکی توجہ اُسی کی جانب ہوئی۔

''ٹھیک ہے! رضا، تم فلحال یہیں رہو گے۔ ہمارا پہلا کام ولید کو کسی نہ کسی طرح باہر لانا ہے۔اور پھر فرح کو پکڑنا۔اگر ہمیں ولید پہلے مل جاتا ہے تو ہم اُسے تمہارے حوالے کریں گے، پھر فرح کے پیچھے جائینگے۔''وحید نے رضا سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ نوید کے ماتھے پر پسینے کے قطرے،اور چہرے پر اضطراب واضح تھا۔وحید اتر چکا تھا،نوید جیپ سے اُتر رہا تھا۔

''نوید! کیا تم اندر جاؤ گے؟''رضا نے اتر کر ایک نظر،چند قدم دور نظر آتے اس بنگلے کو دیکھا۔

''ہاں!''

''یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔''اُس نے کہا۔

''میں اس سے بھی زیادہ خطرناک آپریشنز پر جا چکا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔رضا چند لمحے اُسے دیکھتا رہا۔پھر چند قدم آگے بڑھا،نوید نے نا سمجھی سے اُسے دیکھا۔اور پھر رضا نے وہ کیا،جو شاید اُسکے تصوّر میں بھی نہیں تھا۔اُس نے آگے بڑھ کر نوید کو گلے لگایا۔نوید ساکت کھڑا رہ گیا۔یہ پہلی پیش قدمی تھی،اُسکے دوستوں میں سے سب سے پہلی۔۔۔

''جیسے جا رہے ہو، ویسے ہی واپس آنا۔''نوید سے الگ ہوتے اس نے کہا۔

''نہیں! ولید کے ساتھ آؤنگا۔''اس نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کہا،آنکھوں میں پہلی بار نرمی تھی۔

''ان شاءاللہ!''اُس نے کہا۔پھر نوید آگے بڑھ گیا۔ساگر، فیصل، شیراز بھی ساتھ گئے تھے۔وحید دوسری ٹیم کو لیڈ کر رہا تھا،جو باہر کی جانب تھی۔

خدا جانے اب کیا ہونے والا تھا؟

----------+---------+--------

گو کہ رات کا پہلا پہر ہی تھا، لیکن شہر کا مضافات ہونے کی وجہ سے یہاں جامد سنّاٹا تھا۔وہ لوگ کیمرے سے بچتے، باری باری گھر کے پچھلے حصے میں بنی کھلی راہداری میں کودے۔

''میں گھر کے اندر جاؤں گا۔اور تم سب باہر سے میری مدد کرو گے۔''نوید نے باقی تینوں کو دیکھا۔

''کیا تمہارا اکیلے اندر جانا مناسب رہے گا؟''ساگر نے پوچھا۔

''اکیلے جانا ہی مناسب ہے، زیادہ لوگ جائیں گے تو نظروں میں آئیں گے۔اور اگر ولید اندر رہی ہو تو وہ اُسے کوئی بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔''اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! خیریت سے جاؤ۔''ساگر نے کہا۔

''میں ولید کو لیکر یہیں آوں گا۔اللہ کی امان میں ''!اس نے کہا۔

''اللہ کی امان میں!''شیراز اور فیصل نے کہا۔نوید بنا قدموں کی چاپ پیدا کیے آگے بڑھ گیا۔

''تم دونوں نوید کی حفاظت کے لیے تیار رہو گے،اور میں فرح کو ہر طرح سے فرار ہونے سے روکوں گا۔''ساگر نے اُسکے جانے کے بعد کہا تو دونوں نے اپنی اپنی پوزیشنز سنبھال لیں۔

دوسری جانب نوید آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے راہداری میں آگے بڑھ رہا تھا۔ گراؤنڈ فلور خالی تھا۔اُس نے بہت احتیاط سے ہر جانب دیکھا،پر کچھ نظر نہ آیا۔اُس نے اپنا ٹرانسیور اُٹھایا اور منہ کے قریب کیا۔

''ساگر! گراؤنڈ فلور خالی ہے۔''اُس نے کہا۔

''ٹھیک ہے! میں شیراز کو مزید لوگوں کے ساتھ اندر تعینات کر رہا ہوں۔''ساگر کی آواز ابھری۔ اُسکے بعد نوید نے ایک نظر اوپر کی طرف جاتی سیڑھیوں کو دیکھا،اور پلٹ کر دروازے کی جانب، جہاں سے شیراز بقیہ ٹیم کے ساتھ محتاط انداز میں اندر آرہا تھا۔نوید نے اُسے دیکھ کر سر ہلایا، پھر سیڑھیاں چڑھتا اوپر گیا۔سامنے لاؤنج تھا، وہ بھی نیم اندھیرا پڑا تھا۔وہ آہستہ سے قدم بڑھاتا آگے بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ ایک کمرے کے باہر آکر اُسکے قدم رکے۔

''تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے؟ میں یہاں محفوظ نہیں ہوں۔انہوں نے مجھے رہا تو کر دیا ہے،اور میں ہر ممکن طریقے سے اُنکی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں آبھی چکی ہوں۔پر مجھے بالکل یقین نہیں ہے کہ وہ مجھے اتنی آسانی سے چھوڑ دیں گے۔تم کچھ بھی

کر کے مجھے یہاں سے نکالو۔'' یہ فرح کی آواز تھی، سو فیصد!۔۔۔نوید کمرے کے باہر دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہوا، اور پستول ہاتھوں میں اٹھائی۔

''تو آخر تم یہاں کیوں نہیں آجاتے؟ جب تم کراچی میں ہی ہو، تو مجھے لے کر یہاں سے نکل کیوں نہیں جاتے؟ ابھی یہاں سے فرار ہونا آسان ہے۔ اگر ایف آئی اے نے کوئی اقدام لے لیا تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ میرے ساتھ کیا کریں گے؟ ابھی تو میں اس بچے کے بل بوتے پر بچ گئی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم آگے کیا ہوگا۔۔۔ تم بس!۔۔۔ تم جلدی مجھے یہاں سے لیکر جاؤ۔'' وہ غالباً فون پر بات کر رہی تھی۔ بلکہ چیخ رہی تھی۔

''اوہ! تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ تم یہاں آنے سے ڈر رہے ہو۔ تمہیں ڈر ہے کہ کہیں تم یہاں آؤ اور پکڑے نہ جاؤ۔'' فرح کی زہر خند آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں!'' وہ دھاڑی تھی۔ ''تمہیں ڈر ہے کہ تم یہاں آؤ گے اور پکڑے جاؤ گے۔ اس لیے تم میری قربانی دینے پر راضی ہو۔ تم نے مجھے گرفتاری کے بعد بھی نہیں بچایا، میں ولید کو سہارا بنا کر وہاں سے نکلی ہوں۔ میری بات کان کھول کر سن لو! اگر تم نے مجھے قربانی کا بکرا بنایا تو میں تمہاری پول بھی کھول دونگی، وہ بھی تمام ثبوتوں کے ساتھ۔'' وہ چلا رہی تھی۔

''وحید بھائی! وہ شخص پاکستان میں ہی ہے۔ آگے سے کچھ نہ کہیے گا۔'' اُس نے ٹرانسیور میں کہا اور بٹن دبا کر اُسے بند کیا۔

دوسری جانب وحید نے اُسکی بات سننے کے بات فوراً عملے کو فرّخ صاحب کو اطلاع دینے کی ہدایت دی، رضا پاس ہی خاموش کھڑا سب دیکھ رہا تھا۔ نوید نے گہرا سانس لیا، اور اگلے ہی لمحے کمرے کے اندر داخل ہوا، فرح کی اُسکی جانب پیٹھ تھی۔ وہ فون بند کر کے اپنے بستر پر پٹخ چکی تھی، اب سر تھامے یہاں سے وہاں ٹہل رہی تھی۔

''تمہارا کھیل ختم ہوا فرح خالد!'' نوید کی آواز پر وہ جھٹکا کھا کر پلٹی۔

''تم؟'' آنکھوں میں بے یقینی اُتر آئی۔ وہ ایک طرح دار اور خوبصورت عورت تھی، لیکن اتنی ہی سفاک بھی۔

''اپنے آپ کو خاموشی سے پولیس کے حوالے کر دو ورنہ تمہیں یہیں مار دوں گا۔''

''مار دو!'' وہ ایک ادا سے مسکرائی۔ ''پھر اپنے بیٹے کو بھی بھول جانا۔'' اگلے ہی لمحے نوید اپنے اور اُسکے درمیان کا فاصلہ ختم کر کے اُسکے پاس آیا، وہ بنا ایک انچ بھی ہلے مسکرائی۔ نوید نے پستول کی نال اُسکے ماتھے پر رکھی۔

''یہ تمہاری بھول ہے کہ تم میرے بیٹے کو اب کہیں چھپا سکتی ہو۔ تم خاموشی سے گرفتاری دو گی ورنہ تمہیں یہیں گاڑنے میں وقت نہیں لگاؤں گا۔'' اگلے ہی لمحے فرح نے ہاتھوں کی مٹھی نوید کے جبڑے پر دے ماری۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ ایک قدم لڑکھڑا کر پیچھے ہوا، پر اپنی پستول نیچے نہیں کی۔ نوید کے سنبھلنے سے پہلے اُس نے اُسکی ٹانگ پر پیر سے وار کیا، اور سرعت سے اُسکے برابر سے نکلی۔ وہ بھی بنا وقت ضائع کیے اُسکے پیچھے آیا اور اُسے بالوں سے جکڑ کر دیوار پر دے مارا۔ اُسکے بعد بھی وہ ذرا نہ گڑبڑائی بلکہ پلٹ کر دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنا کر، ایک کو چہرے کے قریب کیا اور دوسرے کو نوید کے منہ پر مارنا چاہا، نوید نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اپنا چہرہ پینتالیس کے زاویے پر ترچھا کیا اور پستول کا بٹ اُسکے سر پر دے مارا، صرف ایک لمحے کو وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوئی، لیکن اب بھی نہ گری۔ دیکھنے میں وہ جتنی نازک تھی اتنی ہی خطرناک تھی۔

''گو کہ تم عورت کے نام پر داغ ہو۔ پر تم ایک اچھی فائٹر ہو۔'' نوید نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اُس نے آبرو اُچکا کر داد وصول کی اور اگلے ہی لمحے اپنا دائیں پاؤں ایک سو اسی کے زاویے پر سیدھا اٹھایا، اتنی تیزی سے کہ اگر مقابل کوئی اور ہوتا تو اپنا منہ تڑوا بیٹھتا، پر وہ نوید تھا۔ اگلے ہی لمحے اُسکا پاؤں پکڑ کر اُسے ہی زمین پر گرا دیا۔

''تم وہ پہلی عورت ہو جسکا لحاظ مجھ پر حرام ہے۔'' نوید نے اُس کے برابر میں تھوکا اور گھٹنوں کے بل بیٹھا تا کہ اُسکے ہاتھ باندھ سکے، لیکن اُس نے پلٹ کر چھوٹا سا، نیل کٹر کے سائز کا خنجر اُس کے گلے پر مارا، وہ پلک جھپکنے میں پیچھے ہٹا پر پھر بھی خنجر اُسکے گوشت کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ وہ اس وار کے لیے تیار نہ تھا۔ اُس نے فوراً اپنا ہاتھ گلے پر رکھا، اتنی دیر میں فرح تیزی سے اُٹھ کر کھڑکی تک گئی، اور اُس قد آدم کھڑکی پر اس طرح بیٹھی، کہ بس ابھی چھلانگ لگا دے گی۔ نوید نے اُسکے پیروں پر گولی چلائی۔ گولی اُسکی ران میں گھسی یا چھو کر نکلی، معلوم نہیں! پر وہ صرف ایک لمحے کو لڑکھڑائی، پھر اگلے ہی لمحے اُس نے کھڑکی کا قبضہ تھام کر خود کو سنبھال لیا۔ وہ مضبوط اور بہترین تربیت یافتہ عورت تھی۔

''نوید! یہ آواز کیسی تھی؟ کیا تم ٹھیک ہو؟'' ٹرانسیور سے ساگر کی آواز ابھری۔

''ایس ایس پی نوید! کیا تم ٹھیک ہو؟'' ساگر پریشان تھا۔

''تو تم ہار نہیں مانو گی؟'' اُس نے دوبارہ پستول اُس پر تانی۔

''میری ہار وجیت کی فکر نہ کرو نوید! اپنے بیٹے کی کرو۔'' وہ زہریلے انداز میں مسکرائی۔ نوید کی انگلی ٹریگر پر مضبوط ہوئی۔

''وہاں سامنے کمرے میں ہی ہے تمہارا بیٹا! مگر افسوس، تم اُس سے کبھی نہیں مل پاؤ گے۔'' اُس نے پیچھے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، نوید نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں اُس نے چھلانگ لگا دی۔ نوید آگے نہیں بڑھا۔ بلکہ ٹرانسیور کا بٹن دبایا اور فوراً بولا۔

''ساگر! وہ پیچھے والی راہداری کے اوپر بنی کھڑکی سے کودی ہے، اُسے فوراً پکڑو!'' اُس نے حکم دیا اور پلٹا۔ اُسکے پیچھے، جہاں فرح نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں دو دروازے تھے۔ ایک بند تھا، جبکہ دوسرا تھوڑا سا کھلا تھا، اندر لائٹ بھی جلی ہوئی تھی۔ وہ دھڑکتے دل سے ادھ کھلے دروازے والے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ دل کو ایک نامعلوم سا احساس ہو رہا تھا۔

دوسری جانب جیسے ہی فرح کھڑکی سے نیچے کود کر واپس کھڑی ہوئی، فیصل اور شیراز نے اُسے چاروں جانب سے گھیر لیا۔

''ہاتھ اوپر!'' شیراز کا لہجہ خطرناک حد تک سفاک تھا۔

''آہ! یہاں بھی۔۔۔'' وہ جیسے مذاق اڑاتی آگے بڑھی، اور شیراز کو مارنا چاہا، پر اتنے سارے لوگوں سے وہ اکیلے نہیں لڑ سکتی تھی، لہٰذا فوراً ہی اُسے قابو کر لیا گیا۔

''اب تم نہیں بھاگ سکتی۔'' ساگر نے اُسکے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔ وہ کوئی پاگل تھی، ذہنی مریض!

''میں تو پکڑی گئی، پر تم اب وہ دیکھو گے جو تم نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔'' وہ اوپر والی کھڑکی کی جانب دیکھتی بولی۔

''کیا کیا ہے تم نے؟'' ساگر نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا تو وہ ہنسی اور دوبارہ اسی کھڑکی کی جانب اشارہ کیا، جیسے کہہ رہی ہو کہ لو! خود دیکھ لو۔

دوسری جانب نوید اُس کمرے سے دس بارہ قدم ہی دور تھا، کہ برابر والا کمرہ پلک جھپکتے میں دھماکے سے اڑا تھا، وہ جھٹکا کھا کر پیچھے گرا۔

''آہ!'' وہ کراہ اٹھا۔

''نوید!'' نیچے کھڑے لوگ چلائے تھے۔ جبکہ فرح ذہنی مریضوں کی طرح ہنسنے لگی تھی۔

''نوید!'' گھر کا اوپری حصہ دھماکے سے اڑتے دیکھ کر وحید اندھا دھند اُسکی جانب بھاگا تھا، رضا بھی اُسکے پیچھے گیا پر عملے نے اُسے روکا۔

''سر! رک جائیں، آپ وہاں نہیں جا سکتے۔''

''دور ہٹو!'' وہ اُنہیں دھکیلتا ہوا گھر کی جانب دوڑا۔

''آہ!'' نوید نے کراہتے ہوئے چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔ گھر میں آگ لگ چکی تھی۔

''ولید۔۔۔'' وہ چیخا، اور پوری ہمت مجتمع کر کے کھڑا ہوا۔ اُسکی طبیعت ویسے ہی درست نہیں تھی، نقاہت ابھی باقی تھی۔ ایسے میں یہ حملہ نا قابل برداشت ہو رہا تھا۔ وہ کھڑا ہوا اور ہمت کر کے کمرے کی جانب دوڑا۔ جس کمرے کا دروازہ بند تھا وہاں سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ کسی بچے کے رونے کی۔۔۔ نوید کا دل ڈوبا۔

''ولید!۔۔۔ ولید۔۔۔ میرا بیٹا۔۔۔'' وہ کمرے کے دروازے کی جانب بڑھا، جسے چاروں جانب سے آگ نے لپیٹے میں لے لیا تھا۔ اُس نے دروازے کو دھکا دینا چاہا پر وہ نہیں کھلا۔

''ولید۔۔۔ میرا بچہ۔۔۔ میرا بیٹا۔۔۔'' وہ تڑپ رہا تھا۔ اُسکا بیٹا ایک بار پھر آگ کی لپیٹ میں تھا، آج ایک بار پھر وہ دروازہ پیٹ رہا تھا۔

''نوید! نوید تم ٹھیک ہو؟ نوید! جواب دو!'' ٹرانسیور سے وحید کی آواز گونج رہی تھی۔

''ایس ایس پی نوید! کیا تم سن رہے ہو؟'' پھر سا گرکی۔ پر اُسے پرواہ نہ تھی، آج وہ نہیں رک سکتا تھا۔ آج نہیں! اس نے پوری قوت لگا کر دروازے پر لات ماری، پھر اُسے دھکا دیا تو آگ نے اُسکے بازوؤں کو لپیٹے میں لیا۔ اُس نے پیچھے ہٹ کر اپنے بازو پر ہاتھ مار کر آگ بجھائی۔

''نوید۔۔۔ نوید بتاؤ تم ٹھیک ہو؟'' ٹرانسیور سے آواز گونج رہی تھی۔ وہ لوگ یقیناً اوپر نہیں آ سکتے تھے، سیڑھیوں پر آگ لگ چکی تھی۔ نوید نے آخری بار دروازے کو دھکا دیا، اور اس بار وہ کھل گیا۔ آگ کے شعلے پلٹ کر باہر آئے تو وہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ پھر آس پاس

دیکھا، قریب کھڑکی پر لٹکے دبیز پردے تک آگ اب تک نہیں پہنچی تھی۔اُس نے آگے بڑھ کر تیزی سے پردہ کھینچا تو وہ روڈ سمیت نیچے آگیا۔اس نے پردہ کھینچا کے خود پر لپیٹا اور اندر کمرے میں کود گیا۔

''ہمیں اندر جانا چاہیے۔'' آگ دیکھ کر رضا چلایا تھا۔

''آگ ہر طرف پھیل رہی ہے، اوپر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔'' فیصل نے جواب دیا تھا۔

''تو کیا میں اپنے بھائی کو اندر چھوڑ دوں؟'' وحید چیختے ہوئے دروازے سے اندر گھسا، تو اُسکے پیچھے رضا اور ساگر بھی اندر دوڑے تھے۔

''فائر ٹینڈر کو بلاؤ! ہمیں آگ بجھانی ہوگی۔'' شیراز نے کہا۔

دوسری جانب نوید کمرے میں داخل ہوا اور پردہ پرے پھینکا۔

''ولید! تم کہاں ہو؟ ولید!'' وہ آس پاس نظریں دوڑانے لگا۔رونے کی آواز اب بند ہو چکی تھی۔اُسکے دل کو انہونی کا احساس ہونے لگا۔

''نہیں! اس بار نہیں۔۔۔۔ولید۔۔۔'' وہ آگ سے جلتے کمرے میں اُسے ڈھونڈنے لگا۔اور اُسی لمحے۔۔۔

اُسی لمحے جب اُسکی آنکھوں میں دھواں بھرنے سے آنسو جما ہونے لگے تھے۔۔۔

اور اُسی لمحے جب آگ کے شعلے کھڑکیوں سے باہر جانے لگے تھے۔۔۔

وہ اُسے سامنے نظر آیا۔میز کے نیچے، جسے قدرتی طور پر ابھی آگ نے نہیں پکڑا تھا، اُس میز کے نیچے، گھٹنے اوپر کیے، اُسکے گرد بازو لپیٹے بیٹھا ہوا۔

آگ کے شعلے کہیں غائب ہو گئے۔۔۔

دھڑکنیں تھم سی گئیں۔۔۔

ہوائیں، سانسیں، سماعتیں سب خاموش ہو گئیں۔۔۔

نوید وہاں رہ گیا اور سامنے سہما سا بیٹھا وہ بچہ۔۔۔

جسکا چہرہ ہو بہو معید جیسا تھا۔۔۔

اور آنکھیں۔۔۔۔

اُس نے خوفزدہ سی آنکھیں اُٹھا کر نوید کو دیکھا۔

وہ بڑی بڑی، مہربان سی غلافی آنکھیں۔۔۔وہ بشریٰ کی تھیں۔

وہ خوفزدہ سا نوید کو دیکھ رہا تھا، بے آواز سسک رہا تھا۔ نوید کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں آگے بڑھا، پھر اُسکے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا۔ ننھے ہاتھوں نے سہم کر میز کی ٹانگ کو پکڑا۔

''ولید!'' نوید کی زبان سے اُسکا نام ادا ہوا۔ آنسو باڑ توڑ کر بھل بھل بہنے لگے۔ وہ رک کر یک ٹک نوید کو دیکھ رہا تھا۔

''اِدھر آؤ! بابا کے پاس!'' اُس نے اپنی ہتھیلی آگے بڑھائی۔ وہ ٹکر ٹکر اُسے دیکھنے لگا۔

''یہاں آؤ بیٹا!'' گلا رندھنے لگا۔ چہرہ آنسوؤں سے تر ہونے لگا۔ ولید نے گھٹنوں سے ہاتھ ہٹایا، اور اُنہیں زمین پر رکھ کر آگے ہوا، پھر رک گیا۔ غالباً وہ خوفزدہ تھا۔

''ہاں! یہاں آؤ۔'' نوید نے مسکراتے ہوئے شفقت سے کہا، اور ہتھیلی مزید آگے کی۔ کھڑکیاں آگ پکڑ رہی تھیں۔ اُس نے اپنا ننھا ہاتھ نوید کے ہاتھوں میں دے دیا، پھر رونے لگا۔ نوید نے کھینچ کر اُسے باہر نکالا اور اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ وہ لمبا تھا، اپنے ہم عمر بچوں کی نسبت اُسکا قد لمبا تھا۔ اپنا چہرہ اُسکے کندھوں میں چھپا کر وہ خود کو محفوظ سمجھنے لگا۔ نوید نے بازو اُسکے گرد لپیٹ رکھے تھے۔

''میرا بیٹا!'' اُس نے آنکھیں بند کیں، اُسکا سر چوما، اُسکے احساس کو اپنے اندر اُتارا۔

''میرا ولید!'' پھر اُسے اور زور سے بھینچا، آنسو آنکھ سے نکل کر ولید کے بالوں میں جذب ہونے لگے۔ اُسی اثنا میں سامنے والی کھڑکی کا پٹ جل کر نیچے گرا۔

''نوید۔۔۔نوید۔۔۔'' اُسے دور سے اپنے نام کی پکار سنائی دی، تو وہ ہوش میں آیا۔

''نوید! تم کہاں ہو؟'' یہ وحید کی آواز تھی۔ اُس نے جلدی سے ولید کو گود میں اٹھایا، اور اُسکے گرد اپنا جیکٹ لپیٹا۔

''بھائی! میں یہاں ہوں۔'' وہ چیخا۔

''وہ اُدھر ہے۔'' یہ رضا کی آواز تھی۔ جانے وہ لوگ کہاں تھے؟ نوید اُنہیں دھویں کی وجہ سے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ دروازے کے سامنے رکھا فرنیچر جل رہا تھا۔ نوید کے پاس باہر جانے کا راستہ نہ تھا۔

اُسی لمحے کسی نے دھکا دے کر سامنے جلتے صوفے کو ہٹایا، اور اُس کے قریب آیا۔

''رضا!۔۔۔ تم؟'' نوید نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''چلو! فوراً نکلو یہاں سے۔'' رضا نے اُسے پکڑ کر گھسیٹا۔ وہ اُسکے ساتھ ہی باہر آنے لگا، اُسی لمحے سامنے وحید بھائی دکھائی دیئے۔

''بھائی! ولید ٹھیک ہے۔'' اُس نے خود کو کہتے سنا۔ اُسکے لہجے میں خوشی کی کھنک بھی تھی، اور آنسوؤں کی نمی بھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ باحفاظت جیپ تک پہنچ چکے تھے۔ اُنہیں زندہ سلامت دیکھ کر فرح کو صدمہ ہی پہنچ چکا تھا۔ اپنے تیئں وہ تمام انتظام مکمل کر کے آئی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ کسی بھی وقت وہ پکڑی جائیگی، لہٰذا اس نے پہلے سے ولید کے کمرے میں ریموٹ بم لگا رکھا تھا۔

نوید نے جیپ کے قریب پہنچ کر جیکٹ اُتاری، فیصل نے جلدی اُسے ٹھنڈا پانی دیا، اُس نے پینے کے بجائے ولید کے منہ سے لگایا تو وہ غٹا غٹ پی گیا۔ پھر دوبارہ اُسکے سینے سے لگ گیا، غالباً وہ اچھا خاصا ڈر گیا تھا۔

''تم ٹھیک ہو نا نوید؟'' وحید اُسے پریشانی سے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں!'' اُس نے سر ہلایا۔ وہ اپنے چہرے پر پانی ڈالنا چاہتا تھا، پر ایک ہاتھ سے ولید کو تھامے ہونے کی وجہ سے وہ کر نہیں سکا۔

''ولید؟'' اُس نے اپنے آپ سے لپٹے ولید کو پیار سے پکارا، پر وہ اُسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔

''کوئی بات نہیں! تم اسے لیکر اندر بیٹھو، ہم فوراً آفس جائیں گے۔'' وحید نے کہا تو وہ اُسے لیکر کھڑا ہوا۔ اِس سے پہلے کہ وہ جیپ میں بیٹھتا، ولید کی نظریں رضا پر پڑیں۔ پہلے اُس نے آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے پہچاننے کی کوشش کی، پھر جیسے ہی پہچان لیا فوراً نوید کے سینے سے سر اٹھایا اور بولا۔

''بابا!۔۔۔بابا!۔۔۔''رضا ساکت رہ گیا۔وہ ہر گز اِسکے لیے تیار نہ تھا۔وہ اپنے باپ کے سامنے اُسے بابا کہہ کر پکار رہا تھا،اپنے بازو وا کیے اُسکی گود میں آنے کے لیے مچل رہا تھا۔رضا نے ہاتھ آگے نہیں بڑھائے بلکہ پریشان کن نظروں سے دونوں کو دیکھنے لگا۔گو کہ ان سب میں اُسکا کوئی قصور نہ تھا،پر نوید کے سامنے اُسکے بیٹے کا اسے بابا کہنا،عجیب طرح سے مجرم بنا گیا تھا۔

''رضا!''نوید نے پکارا تو اُس نے دیکھا،چہرے پر نرمی تھی۔

''اسے لے لو۔تمہیں دیکھ کر رک نہیں رہا میرے پاس۔''اُس نے عام سے لہجے میں کہا تو رضا نے اسے گود میں لے لیا۔اُسکے پاس آکر وہ پر سکون ہو گیا۔

نوید نے ایک نظر دونوں کو دیکھا،پھر مسکراتا ہوا جیپ میں بیٹھ گیا۔

وہ کیوں مسکرایا تھا؟معلوم نہیں!

پر وہ مسکراتے ہوئے اچھا لگتا تھا۔

----------+---------+--------

''یہ مکمل معلومات ہیں اُس شخص کی۔۔۔''شیراز نے فائل اُسکی جانب بڑھائی تھی،جسے اُس نے تھام تو لیا،لیکن جانچتی ہوئی نظریں شیراز پر ہی تھیں۔

''ایس ایس پی ساگر نے ابتدائی تفتیش میں جو معلومات حاصل کی ہیں،اُسی کی بنا پر وہ اُس اصل مجرم کو گرفتار کرنے گئے ہیں۔بقیہ تفتیش فیصل اور میں کر رہے ہیں۔''اُس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے!''نوید نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ جانے کے لیے مڑا۔

''شیراز!''اُس نے پکارا۔

''جی!''اُس نے پلٹ کر سنجیدگی سے دیکھا۔نوید چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔اُسکی وہ زندہ دل ہنسی کہیں کھو گئی تھی۔ نوید نے گہری سانس بھری،پھر چند قدم چل کر اُسکے پاس آیا۔

''تم نے قانون ہاتھوں میں لیا، صحیح کیا یا غلط میں نہیں جانتا۔'' وہ رکا، اور اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ ''لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ تم نے وہ کیا جو میں سالوں سے کرنا چاہتا تھا، پر نہیں کر سکا۔'' اُس نے نرمی سے کہا۔

''لیکن بعض دفعہ انتقام لیکر بھی سکون نہیں ملتا۔'' شیراز نے آہستگی سے کہا۔ پھر جانے کے لیے پلٹ گیا، نوید اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ باہر بارش بھی طوفانی ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت ایف آئی اے کی عمارت میں بنے لیونگ روم میں بیٹھے تھے۔ ولید درمیان میں رکھی میز پر بیٹھا تھا، اُسکے سامنے رضا کا موبائل تھا، جس پر وہ اپنا پسندیدہ نمبر گیم کھیل رہا تھا۔ باقی سب بھی وہیں تھے۔ خوش بھی تھے، پر اب اپنے گھر واپس جانے کو بے چین بھی۔

''یہ کافی ذہین ہے ماشاءاللہ!'' علی نے اسکو مہارت کے ساتھ ایک کے بعد ایک لیول جیتتا دیکھ کر کہا۔

''ہاں! بہت۔۔۔ کبھی کبھی مجھے حیران کر دیتا ہے۔'' رضا نے کہا۔ نوید، وحید اور بقیہ ٹیم ایف آئی اے کے مشاورتی کمرے میں تھے، جبکہ اُن سب کو ولید کے ساتھ، یہاں بلوا لیا گیا تھا۔

''اِس نے ڈیڑھ سال کی عمر میں ایک سے سو تک مکمل گنتی یاد کر لی تھی، پھر لاکھ تک۔ اسے ڈھائی سال کی عمر تک، بنیادی حساب کتاب، جمع و تفریق وغیرہ آ چکا تھا۔ یہ بڑے مزے سے نمبر بلاکس سے کھیلتا ہے۔ اُسکے علاوہ اسے موبائل میں بھی وہی گیمز پسند ہیں جن میں نمبرز ہو۔ ان گیمز سے یہ زیادہ اچھی میتھس سیکھتا ہے۔ اُسکی multiplication مجھ سے بھی کئی گنا اچھی ہے۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یعنی میتھ پسند ہے اسے۔'' مقدّم نے کہا۔

''ہاں! بہت زیادہ۔۔۔ یہ گھروں کو انکے ایڈریس سے یاد رکھتا ہے، نام سے نہیں! بعض دفع میں حیران رہ جاتا ہوں کہ اسے اتنی زیادہ تعداد میں، اور بالکل درست نمبر یاد کیسے رہتے ہیں۔ لیکن یہ مجھے حیران کر دیتا ہے۔'' وہ خوش دلی سے بتا رہا تھا۔

''بچے کا انٹرسٹ (دلچسپی) جس شے میں ہو وہ اسے جلدی سیکھتا ہے۔'' عمر نے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔اسے انگلش میں بالکل دلچسپی نہیں ہے۔ کوشش کر کے تھک گئے، پر اسے الفابیٹس یاد نہیں ہو کر دیئے۔ تو میں نے بھی چھوڑ دیا۔ جو پسند ہے، ابھی اس پر فوکس کرے، باقی وقت آنے پر سب سیکھ ہی لے گا۔'' رضا نے کہا۔ باہر بادل زور سے گرج رہے تھے۔

''میرے بیٹے کو تو بچپن سے ہی درخت پر اُلٹا لٹکنے کا شوق ہے۔'' حسین کو یکدم ہی یاد آیا تو کہا۔

''کوئی شک نہیں کہ وہ تمہاری اولاد ہے۔'' مقدم نے کہا تو بہت دنوں بعد سب ہنسے تھے۔ حسین نے البتہ کان کھجائے تھے۔

''تم اسے ٹائیکوانڈو سکھا سکتے ہو۔'' رضا نے مفت مشورہ دیا۔

''نہیں بھئی! ابھی اس نے تگنی کا ناچ نچایا ہوا ہے، یہ سب سیکھ لیا تو پہلا تجربہ میرے اوپر ہی کرے گا۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولا تو ایک بار پھر سب ہنسے تھے۔

''مکافات عمل ہے یہ۔۔۔'' مقدّم نے فقرہ کسا تو وہ مسکرایا۔ بس! کچھ ہی گھنٹے تھے، پھر وہ اپنے بچوں کے پاس ہو گا۔ مہینے بھر سے انکا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

اسی لمحے نوید مشاورتی کمرے سے باہر آیا، اُسکے آنے پر غیر معمولی طور پر ولید نے اپنا کام چھوڑ کر چہرہ اٹھایا اور اسے دیکھا تھا۔ اُس نے بھی رک کر دیکھا، اور مسکرایا۔ نرم سی مہربان مسکراہٹ۔۔۔

پھر اُنکے پاس آیا، ہاتھوں میں ایک فائل تھی۔ وہ فرح کی گرفتاری کے پورے تین گھنٹے بعد اب آیا تھا۔

''فرح کا کھیل ختم ہوا۔ اُسکے پاس کوئی چارہ نہیں تھا سوائے سب کچھ بتانے کے۔'' بنا تمہید کے بات شروع کرتے وہ صوفے پر بیٹھا۔

''اُس نے بتایا جس گینگ، یا مافیا کے لیے وہ کام کر رہی ہے، اُسکے سربراہ نے اُس سے شادی کر رکھی ہے۔ مائیکل، بھی اسی گروہ کا حصّہ تھا۔ ان لوگوں نے اپنے کاموں کو تقسیم کر رکھا ہے۔ اور ہر کام کے لیے ایک ہیڈ ہے، جو اپنے حصے کے لوگوں کا نگراں ہے۔ مائیکل ایک قاتل تھا، اور اس گروہ کے لیے قتل و غارت گری کرنے والے تمام لوگوں کا نگران بھی وہی تھا۔ یہ لوگ منشیات فروشی، انسانی اعضاء کی خرید و فروخت، اسمگلنگ اور مزید غلط کاموں میں ملوث ہیں، البتہ کام مکمل منظم طریقے سے کرتے ہیں۔''

''پر انکا ہم سے کیا تعلق تھا؟''عمر نے پوچھا۔

''تعلق ہے، ہم سب کا تعلق ہے۔ تمہیں یاد ہے صنوبر کو اغوا کرنے والا صرف عاصم نہیں تھا، بلکہ کوئی اور بھی تھا اس کے ساتھ۔۔۔'' اُس نے علی کی جانب دیکھا۔ یہ صنوبر ایک مرتبہ پھر سے منظر عام پر کیسے آگئی تھی؟

''وہ یہی شخص تھا، اسی گروہ کا سرغنہ۔۔۔اِس نے خود کو بچانے کے لیے سارا الزام اکیلے عاصم کے سر ڈال دیا۔ اُسکی ہم سے دشمنی ہی یہی تھی کہ ہم اس کیس کے چشم دید گواہ تھے۔''اِس بات پر سب کا منہ کھلا۔

''تو اس انسان نے اتنے سال ہم سے بدلہ لینے کا پورا منصوبہ بنایا؟''عمر نے بے یقینی سے کہا۔

''ہاں!''نوید نے مختصر جواب دیا اور حسین کو دیکھنے لگا۔

''پر وہ شخص ہے کون؟''مقدّم نے سوال کیا۔

''وہ فرح کا شوہر ہے۔ لیکن فرح اُسکی واحد بیوی نہیں ہے۔ بلکہ اسکی تیسری بیوی ہے۔ جو اُسکے لیے یہ سارے غلط اور غیر قانونی کام کرتی ہے۔ اپنی دوسری بیوی کو وہ طلاق دے چکا ہے۔ البتہ فرح کا کہنا ہے کہ وہ اپنی دوسری بیوی سے بھی یہی تمام کام کروانا چاہتا تھا، پر وہ اپنی بیٹی سمیت اسے چھوڑ کر فرار ہو گئی تھی۔''اُس نے رک کر ایک سرسری سی نظر علی پر ڈالی، جسکا چہرہ تاریک ہوا تھا۔

''اور اُسکی پہلی بیوی، اُسکی خاندانی اور قانونی بیوی ہے۔ جسے اُسکے ان تمام کاموں کی خبر نہیں ہے۔ اور وہ۔۔۔''نوید رکا، اور پھر حسین کو دیکھا۔

''وہ ایمان ہے۔ حسین کی ماموں زاد ایمان۔۔۔جو شخص ان تمام کاموں میں ملوث ہے اسکا نام اظہر ہے۔ اظہر الدین تقی۔۔۔''حسین کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ پر جب سمجھ آیا تو لگا جیسے کسی نے زبان مفلوج کر دی ہو۔

''ایسا کیسے۔۔۔''وہ کچھ بول نہ سکا۔

''ایسا ہی ہے۔سب کچھ بہت عجیب ہے۔۔۔پر ایسا ہی ہے۔''نوید نے سنجیدگی سے کہا۔''اظہر کی گرفتاری کے لیے پچھلے دو گھنٹے سے چھاپے مارے جا رہے ہیں۔اُسکے گھر والے اتفاقاً پاکستان آئے ہوئے ہیں،اُنہیں بھی تفتیش کے لیے گرفتار کیا گیا ہے۔''اُس نے گھر والے کہا،دانستہ ایمان کا نام نہیں لیا۔

''کیا تم لوگ ایمان کو بھی گرفتار کرو گے؟''حسین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں!''اِس جواب پر اُس نے لب بھینچے۔

''مجبوری ہے۔ہم نہیں جانتے کہ اسکے گھر والے اس جرم میں شریک بھی ہیں یا نہیں!''اُس نے سمجھایا۔

''تو اتنے سال اس نے صرف اس لیے انتظار کیا،کہ وہ ہم سے بدلہ لینا چاہتا تھا؟''مقدّم نے پوچھا۔

''وہ ایک مکمل سائیکو ہے۔اُسکی جس انسان سے ذرا سی بھی دشمنی ہو،اُس سے بدلہ ضرور لیتا ہے۔لیکن اسکے لیے صحیح وقت کا انتظار بھی کرتا ہے۔''اُس نے رک کر علی کو دیکھا،جو اِس وقت ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔

''سر!''اسی لمحے فیصل دوڑتا ہوا،وہاں آیا تھا۔

''کیا ہوا؟''اُس نے پوچھا۔

''ایس ایس پی ساگر نے ایئرپورٹ سے ہی اظہر کو گرفتار کر لیا ہے،وہ ملک سے باہر جا رہا تھا،لیکن خراب موسم کی وجہ سے تمام فلائٹ کینسل ہو گئی ہیں۔وہ بھاگنا چاہتا تھا لیکن ایس ایس پی ساگر نے بروقت وہاں پہنچ کر اُسے گرفتار کر لیا ہے۔''

''وہ لوگ کہاں ہیں اِس وقت؟''

''راستے میں ہیں۔اُسکے گھر والوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔وہ آ چکے ہیں۔''

''کہاں؟''یہ سوال حسین نے کیا تھا۔

''عمارت کے احاطے میں ہی ہیں۔اُنہیں تفتیش کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔''اُس نے کہا تو حسین کھڑا ہوا اور تیزی سے باہر نکلا۔

''اسکے ساتھ جاؤ!''اُس نے رضا اور مقدّم کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔اِس وقت وہی دونوں اُسے سمجھا سکتے تھے۔ وہ دونوں بھی اُسکے پیچھے گئے تھے۔ عمر بھی یہاں بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا، لٰہذا وہ بھی اُٹھ کر اُنکے پیچھے گیا۔ نوید نے جھک کر ولید کو گود میں اٹھالیا۔ پھر اُسے اپنے بازوؤں میں بھینچ کر اُسکے گالوں پر پیار کیا۔ یہ محبت کا پہلا عملی مظاہرہ تھا۔ وہ ایسے مظاہرے کم ہی کرتا تھا۔ پھر وہ گم صم سے بیٹھے علی کے قریب آیا۔

''علی!''اُس نے پکارا۔

''ہونہہ؟''وہ چونکا۔

''پریشان نہ ہو۔ فاطمہ اُسکی سابقہ بیوی تھی، اور وہ اُسے سال بھر قبل چھوڑ چکا تھا۔اِس لیے وہ ان سب میں شامل نہیں ہوگی، نہ ہی اُسے گرفتار کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ضروری ہوا بھی تو میں خواتین عملہ تمہارے گھر بھیج دوں گا، وہ اُس سے ضروری معلومات لے لیں گی۔''اُس نے نرمی سے کہا۔ آج اُسکے انداز میں نرمی، شفقت اور رحم اُتر آیا تھا۔

''شکریہ! لیکن تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''وہ سنجیدگی سے کہتا کھڑا ہوا اور جانے کے لیے مڑا۔

''ہر چیز ضرورت کے تحت نہیں کی جاتی۔''اُس نے آہستہ سے کہا تو علی واپس پلٹا اور اُسے گھورا، پہلی بار وہ مسکرایا۔ چہرے پر دوستانہ سا تاثر اُبھرا۔

''تمہیں اپنے آفس بلا کر، تم سے تمہارا مسئلہ پوچھنے والا کون تھا؟ تمہارا دشمن؟''اِس سوال پر علی نے مسکراہٹ روکی۔ اُس نے صبح ہی کہا تھا کہ میں نے اپنا دوست کھو دیا، اب جواب دینا تو بنتا تھا۔

''ہاں! تم مجھ سے میری پریشانی پوچھ سکتے ہو۔ پر اپنی بتا نہیں سکتے۔ خود کو دوست کہتے ہو، پر مجھے نہیں سمجھتے۔''اس نے کہا۔

''جب ہم دوست تھے میں نے تب بھی اپنی پریشانی نہیں بتائی۔۔۔ کبھی نہیں۔ اِسکا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنا دوست کھو دیا۔ بس! مجھے عادت نہیں ہے کہنے کی۔''پہلی بار اُس نے دل سے کہا تھا۔ ولید اُسکی گود میں اونگھنے لگا تو اپنا سر اُسکے کندھے پر رکھ لیا۔

''تم نے مجھے تھپڑ مارا تھا۔''علی کے لبوں سے شکوہ پھسلا، دس سال پرانا شکوہ!

''تم اسی لائق تھے۔''اِس بار دونوں ہنسے تھے۔ایس ایس پی صاحب بھی۔

''مجھے عاصم نے فون کیا تھا۔''اُس نے اچانک ہی کہاتو علی نے نا سمجھی سے دیکھا۔

''کس نے؟''

''عاصم! جس نے صنوبر کو قتل کیا تھا۔ جھگڑے والے روز سے قبل،اُس نے مجھے فون کیا تھا۔اور کہا تھا کہ۔۔۔''وہ رکا۔

''کہ؟''علی نزدیک ہوا۔

''کہ وہ میرے اور صنوبر کے بارے میں جانتا ہے۔''اُسکی آواز آہستہ ہوئی۔ غیر محسوس انداز میں اس نے ولید کا سر تھپتھپایا تھا۔

''کیسے؟''

''معلوم نہیں! گو کہ میں نے کبھی صنوبر سے کام کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی۔پر اس نے از خود یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔اور اُس نے مجھے یہ بھی دھمکی دی تھی کہ وہ اُس دوسرے شخص کی جگہ مجھے پلانڈ کر دے گا۔اِس لیے علی! میں اِس لیے پیچھے ہٹ گیا تھا۔''نوید میں تبدیلی واضح تھی۔اُس نے آج کھل کر ساری باتیں کہہ دی تھیں۔

''تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا نوید! اگر تم بتا دیتے تو۔۔۔''علی کہتے کہتے رک گیا۔ وہ اُداسی سے مسکرایا۔

''میں نے تو صنوبر کے بارے میں بھی نہیں بتایا تھا۔ میں نے کہاتو، مجھے کہنا ہی نہیں آتا تھا۔اور پھر اُس وقت میں ڈر گیا تھا علی! میں نے اُسکی ہر بات پر یقین کر لیا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹنا بہتر سمجھا۔ میں جانتا تھا تم ناراض ہو گے پر اتنا۔۔اِسکی امید نہ تھی۔''اُس نے اپنے تمام خدشات سے آگاہ کر دیا۔

''میں بھی بہت جذباتی تھا۔اور اسی وجہ سے ہم سب کا نا قابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔''علی نے بھی اعتراف کیا۔ اِس سے قبل کہ نوید کچھ کہتا، باہر سے شور اٹھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''علی نے پوچھا۔

''شاید اظہر کو گرفتار کر کے لے آیا ہے سا گر!'' وہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔ کھلی راہداری سے گزرتے وہ عمارت کے احاطے میں ناقابلِ یقین رش دیکھ سکتا۔ راہداری پار کر کے وہ جیسے ہی احاطے میں پہنچا، وہاں اُسے میڈیا کا جمِ غفیر نظر آیا تھا۔ پہلے تو نوید کا منہ کھلا، پھر اُس نے لب بھینچ کر فیصل کو دیکھا۔

''یہ میڈیا یہاں کیا کر رہا ہے؟'' اُس نے سختی سے پوچھا۔

''جب اُسے ایئرپورٹ پر گرفتار کیا گیا تو کچھ لوگوں نے ویڈیو بنا کر وائرل کر دی تھی۔ اب میڈیا اصل حالات جاننے کے لیے یہاں پہنچ چکا ہے۔'' وہ لب بھینچے راہداری سے اُتر کر وہاں تک آیا۔ پولیس وینز اور عملہ موجود تھا۔ میڈیا کے چند ایک لوگ بھی اندر گھس گئے تھے، باقی دروازے سے باہر ہی روک دیے گئے تھے۔

''میڈیا کو باہر نکالو!'' نوید نے حکم دیا۔

''سر! آزادانہ رپورٹنگ ہمارا حق ہے۔ ہمیں اندر آنے دیں۔۔۔'' ایک رپورٹر چیخا تھا۔

''آزادنہ رپورٹنگ کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ منہ اٹھا کر، بنا اجازت یہاں گھس جائیں۔'' سا گر نے سختی سے کہا۔ پھر عملہ اُنہیں باہر دھکیلنے لگا۔

''حسین! تم ٹھیک ہو؟'' نوید نے اُسکے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

''انہوں نے ایمان کو وین میں بٹھایا ہوا ہے۔ اب تک نہیں اُتارا۔'' اُس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''فکر نہ کرو! میڈیا باہر نکل جائے تو اُسے اُتار دیں گے۔'' اُس نے تسلی دی تو اُس نے سر ہلایا۔ میڈیا کو باہر نکال کے دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ اب سب سے پہلے اظہر کے گھر والوں کو اتارا گیا۔ ایمان کو بھی دو خاتون عملے نے پکڑ رکھا تھا۔ حسین نے ضبط سے آنکھیں میچیں۔ جو بھی تھا، وہ اُسکی کزن تو تھی۔ اظہر کا باپ، ماں اور بھائی بھی موجود تھے۔ ایمان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اُن سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا، اب دوسری وین سے اظہر الدین تقی کو اتارا جا رہا تھا۔ وہ خوش شکل مگر سفاک انسان تھا، آنکھوں میں خون جما دیتی سرد مہری اور

چہرے پر طنزیہ ہنسی موجود تھی۔ جیسے اُسے گرفتاری سے کوئی فرق ہی نہ پڑتا ہو۔ چاہے فرح ہو، سمیر ہو یا یہ بدبخت۔۔۔ان مجرمین کے چہرے سے ہنسی جدا ہی نہ ہوتی تھی۔ انکو یقین تھا کہ کوئی اُنکا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

علی کی رگیں اُسے دیکھ کر تن گئی تھیں، اُس نے ایک بار اِس شخص کو فاطمہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ دل ہی دل میں اُس نے خدا کا شکر بھی ادا کیا تھا کہ اُسکی بیوی اور بیٹی اِس آدمی کے چنگل سے آزاد ہو چکی تھیں۔ باحفاظت!

اظہر کو روتے ہوئے دیکھتی، ایمان کی نظریں یکدم ہی سامنے کھڑے حسین پر گئیں جو اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو اُسکی آنکھیں حیرت سے وا ہوئیں، پھر اُن میں شناسائی کی رمق اُبھری۔

''حسین!'' اُسکے لب ہلے۔

''میں اِس سے بات کر سکتا ہوں؟'' اُس نے نوید سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے!'' اُس نے اثبات میں سر ہلاتے اجازت دی، تو وہ اُس کی جانب بڑھا۔

اُنکی نظریں سکون سے کھڑے اظہر پر تھیں، ایف آئی اے کا پبلک ریلیشن منیجر اُسکی تصاویر لے رہا تھا۔

مجرم بلآخر گرفتار ہو گیا تھا۔۔۔

تو کیا یہ اختتام تھا؟

یا ابھی بھی کچھ باقی تھا؟

----------+---------+--------

اظہر الدین تقی، ایک بڑا کاروباری حلقہ جسکا دوست تھا۔ اپنے باپ کی طرح جس نے بہت دولت سمیٹی تھی، جو اپنے باپ کی تمام تر دولت کا اکلوتا وارث تھا۔ لیکن دولت جسکے لیے کافی نہ تھی۔ اُسے طاقت بھی چاہیے تھی، طاقت کا نشہ، دولت سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

جن دنوں وہ ایک نجی جامعہ میں زیرِ تعلیم تھا، اُس وقت ایک ایسا طبقہ اُسکا دوست بنا، جو دولت کا استعمال حرام کاموں میں کرتا تھا۔ رات بھر عیاشیاں، پارٹیاں اور نشے میں لگے رہنا۔ اُنہی دنوں اُسکی ملاقات صداقت نامی ایک ادھیڑ عمر شخص سے ہوئی۔ وہ اسی نائٹ کلب کا مالک

تھا، جس میں اظہر کا روز کا آنا جانا تھا۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ یہ شخص صرف اِس کلب کا مالک نہیں بلکہ ایک پورے گروہ کا سرغنہ ہے، تو اُس نے اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنے سے دوگنی عمر کے اس شخص کو دوست بنایا۔

صداقت نے اُسے کچھ منشیات دیں اور کہا کہ اُسے ایک ہفتے میں فروخت کر کے دکھائے، تو وہ اُسے اپنے گروہ میں شامل کر لے گا۔ اُس سے ڈھیروں نشہ آور چیزیں خرید کر اظہر، اپنے اُس حلقہ احباب میں تقسیم کرنے لگا، جو طبقاتی فرق کی وجہ سے اُس سے دولت میں کہیں پیچھے تھا۔ اظہر جیسے چالاک شخص نے ہر قسم کے لوگوں سے دوستی گانٹھ رکھی تھی، وہ اُن سے ہر طرح کے کام لیتا تھا۔ عاصم بھی اُنہی میں سے ایک تھا۔

جس سیاسی جماعت سے عاصم تعلق رکھتا تھا، اُسکا سربراہ اظہر کے باپ کا دوست تھا۔ عاصم اُس جماعت کی طالبہ تنظیم کا لیڈر تھا۔ ہر طرح کے برے کاموں میں ملوث یہ شخص انتہائی گھٹیا تھا۔ یہ اظہر سے منشیات خریدنے کر جامعہ کے طلبہ وطالبات کو دیتا تھا۔ لڑکیوں کے لیے یہی کام فرح کرتی تھی۔

فرح ہاسٹل میں رہنے والی انتہائی نچلے طبقے کی لڑکی تھی، اُسکا باپ گاؤں میں بھٹی پر روٹیاں لگاتا تھا، بیٹی کو پڑھنے بھیجا تھا تا کہ وہ کچھ بن سکے، پر اُس نے دولت کمانے کے لیے شارٹ کٹ چنا۔ عاصم کی رائٹ ہینڈ کے طور پر وہ ایسی لڑکیوں سے دوستیاں کرتی، جن کا خاندان مضبوط نہ ہوتا، وہ اُنکی عاصم، اور اُسکے گروہ کے دیگر لڑکوں سے دوستیاں کروا دیتی، کچھ کو محبت کے جال میں پھنساتے ہوئے، دوسرے ملکوں میں بیچ دیا جاتا۔ پیچھے انکا خاندان رو پیٹ کر خاموش ہو جاتا۔ ان تمام کارروائیوں کے بدلے اظہر نے صداقت کے قریب اپنی جگہ بنا لی، اب وہ اُسکا نائب بن چکا تھا۔

جب وہ زمانہ طالب علمی سے فارغ ہوا تو اپنے باپ کا کاروبار سنبھال لیا، بادی النظر میں وہ ایک شاندار شخصیت کا پڑھا لکھا انسان تھا۔ اُنہی دنوں جب صداقت نامی شخص فوت ہوا، اور اُسکے بدلے اظہر جان نشین ہوا، تب ہی اُسکی منگنی فاطمہ سے طے ہو گئی، وہ لڑکی اُسے پسند تو بہت تھی پر وہ ایک گھریلو قسم کی لڑکی تھی، اور اظہر ایسی لڑکی کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اُسکے نزدیک گھر بیٹھی عورت سوائے شوہر پر نظر رکھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی، وہ ایسی عورت کا متحمل نہ تھا۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ فاطمہ اُسے پسند تھی۔ لہٰذا اُس نے فاطمہ کے گھر والوں سے صاف کہا کہ وہ کریئر اورنٹیڈ لڑکی چاہتا ہے لہٰذا فاطمہ کو بھی اِس بارے میں سوچنا چاہیے۔ اُسے اُمید تھی کہ اُسکی شاندار

شخصیت کے آگے کوئی بھی لڑکی زیر ہو سکتی ہے، لہٰذا وہ بھی اِس پر راضی ہو جائیگی، پھر وہ اُسے اُسی کے مستقبل میں مصروف کر دے گا۔

لیکن اُسے حیرت کا شدید جھٹکا تب لگا، جب فاطمہ نے اُسے مسترد کر دیا۔ اُسے اُمید نہ تھی کہ ایسا ہو گا۔

اپنی ریجیکشن اُسکے دل پر لگی تھی، پر اُس سے بدلہ لینے کی شدید خواہش کو اُس نے بعد کے لیے ٹال دیا کہ اُن دنوں اُسکی ماں زور و شور سے اُسکے لیے لڑکیاں دیکھ رہی تھیں، اور فاطمہ کے فوراً بعد انھوں نے حور عین کو پسند کر لیا تھا۔

دوسری طرف اُنہی دنوں عاصم کو فرح کی روم میٹ لڑکی صنوبر پسند آگئی، وہ ہر صورت اُسے اپنے لیے چاہتا تھا۔ لیکن اِس مرتبہ فرح کو کھلی ناکامی ہوئی۔ وہ بے شک غریب باپ کی بیٹی تھی لیکن بہت رکھ رکھاؤ والی اور بہت سوبر سی تھی۔ وہ نہ کسی سے دوستی کے حق میں تھی اور نہ کہیں آتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ عاصم کی ضد بن گئی۔ ایک مرتبہ فرح اُسے زبردستی اپنے ساتھ یہ کہہ کر لے گئی کہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کسی پارٹی میں جا رہی ہے، وہ اپنے باپ سے اجازت لیکر بہت مشکل سے جانے پر راضی ہوئی۔ وہاں جا کر جب اُس نے عاصم اور بقیہ لوگوں کو نا صرف غیر اخلاقی حرکات بلکہ نشے کے استعمال میں دیکھا تو فوری طور پر وہاں سے بھاگ آئی۔ یہی عاصم کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ کہ اُس نے دروازے پر پہرے نہ بٹھائے تھے۔

وہ واپس تو آگئی پر اُس نے فرح کو یہ دھمکی دی کہ وہ سب کو بتا دے گی۔ اُسکی اِس دھمکی کو عاصم نے ہوا میں اچھال دیا تھا۔ لیکن مسئلہ تب کھڑا ہوا، جب اُس نے واقعتاً فرح کی شکایت اُس ہاسٹل کی وارڈن سے کر دی۔ اور یہی اُسکی زندگی لینے کا سبب بن گئی۔ ہاسٹل کی وارڈن کو تو فرح نے پیسے دے کر خرید رکھا تھا، البتہ یہ خبر اظہر تک پہنچ گئی۔ اُس نے عاصم کو آڑے ہاتھوں لیا اور فوراً اُس لڑکی کو ختم کرنے کہ مطالبہ کیا۔ عاصم تو پہلے ہی اُس سے بدلہ لینے کو تیار تھا۔

اُس رات دونوں نے صنوبر کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ صنوبر کسی صورت آنے کو راضی نہ تھی، لیکن فرح نے اُسے بلیک میل کیا کہ جس رات وہ اُسے نائٹ کلب لے گئی تھی، اس رات کی ویڈیو اور سی ٹی وی ریکارڈنگ موجود ہے، اور وہ اُسکے باپ کو بھیج دے گی۔ صرف اِس دھمکی کے زیرِ اثر صنوبر نے وارڈن کو جھوٹ کہا کہ وہ فرح کی بہن کی مایوں میں جا رہی ہے۔ لیکن در حقیقت وہ عاصم سے یہ معاہدہ کرنے گئی تھی کہ وہ اُسکی ویڈیو ڈیلیٹ کر دے، وہ کسی کو کچھ نہ بتائے گی اور اپنا منہ بند رکھے گی۔ بھلا عاصم، یا اظہر کو ایک غریب لڑکی کے

منہ کھولنے سے کیا ہی فرق پڑنا تھا؟ وہ تو بس بدلہ لینا چاہتے تھے۔اور صنوبر جتنی بھی سمجھدار صحیح، پر یہاں اُس نے بیوقوفی کی انتہا کر دی تھی۔اُسے لگتا تھا کہ وہ عاصم سے ڈیل کر لیگی، اور وہ کچھ نہیں کریگا۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' بورن فائر والی رات وہ اُس سے جامعہ میں ملی تھی۔وہ گاڑی سے باہر اُتر کر کھڑا تھا، اندر ڈرائیونگ پر اظہر بیٹھا تھا، چہرے پر ماسک تھا، نہ بھی ہوتا تب بھی صنوبر اُسے نہ پہچانتی، نہ وہ اسے جانتی تھی۔

''کہیں چل کر بات کرتے ہیں، یہاں کھڑے ہونا اچھا تھوڑی لگ رہا ہے۔'' عاصم بے غیرتی سے بولا۔

''میں یہاں تمہارے ساتھ کہیں جانے نہیں آئی۔جو بات کرنی ہے یہیں کرو!'' اُس نے آس پاس دیکھتے رک کر کہا۔فرح وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔اُسے سمجھ آ گیا کہ وہ یہاں آ کر بہت بڑی غلط کر چکی ہے۔

''تو تم چل رہی ہو یا نہیں؟'' اُس نے سختی سے پوچھا۔گول سڑک کی دوسری جانب کچھ لوگ نظر آ رہے تھے۔صنوبر کو حوصلہ ملا۔

''نہیں! کیا کرو گے ورنہ؟'' وہ حلق کے بل چیخی۔وہ چاہتی تھی کہ اُسکی آواز دوسری طرف نظر آتے لوگوں تک پہنچ جائے۔

''اِسے اندر لاؤ عاصم!'' اظہر نے کہا تو اگلے ہی لمحے عاصم نے اُسے جھٹکے سے گاڑی کے اندر کھینچا، اور اُسکے کچھ بھی کرنے سے پہلے اظہر نے گاڑی چلا دی۔

''چھوڑو مجھے!'' وہ تڑپ کر چیخی۔

''خاموش!'' عاصم نے اُسکے منہ پر تھپڑ دے مارا۔دروازہ لاک ہو چکا تھا۔

''کوئی بچاؤ۔۔۔بچاؤ!'' وہ چیختے ہو پیچھے پلٹ کر دیکھنے لگی۔اُسے وہ لوگ گاڑی کے پیچھے آتے، بھاگتے ہوئے دکھائی دیے تھے۔اور اُن میں جو سب سے لمبا تھا۔۔اُسے وہ پہچان گئی۔

وہ جو ساری دنیا میں واحد پیارا لگتا تھا۔۔۔

وہ جو نرم گو تھا، اور گھنٹوں اُسکی باتیں سنتا تھا۔۔۔

وہ یعنی نوید عالم!

اُسے امید تھی کہ وہ اسے بچالے گا۔پر ہر امید پوری نہیں ہوتی۔۔۔

اسی گاڑی میں صنوبر کی زندگی اور عزت کی وہ آخری رات تھی۔

----------+---------+--------

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''اظہر حلق کے بل چیخ رہا تھا۔

''کیسے؟کیسے وہ لوگ عاصم کو پہچان گئے؟اور وہ بھی اتنے اندھیرے میں۔۔۔

''میں نے کہا بھی تھا عاصم کو کہ اپنا چہرہ ڈھانپ کر رکھے۔''صنوبر کو وہ لوگ اپنے جانتے دفنا آئے تھے،پر اُسکی لاش مل گئی تھی۔عاصم پکڑا گیا تھا اور چشم دید گواہ بھی نکل آئے تھے۔اظہر کو اطلاع ملی تو اُس نے آسمان سر پر اٹھالیا۔اب جبکہ وہ اپنے گروہ کا سرغنہ بن چکا تھا، ایسے میں وہ اتنی بڑی غلطی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

''وہ چشم دید گواہ کون ہیں؟''اُس نے اپنے پاس کھڑے،خاص آدمی سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا سر!میڈیا پر کہیں انکی تصاویر اور نام نہیں موجود ہیں۔نہ ہی کسی کو گواہان کے بارے میں معلومات دینے کی اجازت ملی ہے۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟کیا وہ گواہان کوئی بہت بڑی چیز ہیں؟''وہ سخت غصّے میں تھا۔

''وہ لڑکے جامعہ میں ہی پڑھتے ہیں۔اُن میں سے ایک کے گھر،صنوبر کا باپ ڈرائیور تھا۔اور اس لڑکے کا باپ ہے بھی اچھی خاصی کاروباری شخصیت،وہ کسی صورت عاصم کو نہیں چھوڑے گا۔اُس نے ہر طرح سے اپنے بیٹے اور اُسکے دوستوں کا نام میڈیا سے چھپا رکھا ہے۔فلحال تو ہم پیشی آگے بڑھوا رہے ہیں، لیکن سنا ہے کہ انہوں نے اپنے بیان میں عاصم کے ساتھ کسی دوسرے آدمی کا بھی ذکر کیا ہے۔ پر وہ اُسے جانتے نہیں ہیں۔''

''اب میری بات غور سے سنو!یا تو ہم عاصم کو بچائیں گے،یا خود کو۔اور اگر خود کو بچانا ضروری ہوا تو عاصم کو فراموش کرنا ہوگا۔''اُس نے اپنے خاص آدمیوں سے کہا۔

''تو کیا اُسکی پارٹی آپکو کچھ نہیں کہے گی؟''

''اُسکی پارٹی اُس سے اعلان لاتعلقی کر چکی ہے۔ ہر شخص کو اپنی ساکھ عزیز ہے۔ تم جاؤ! اور کسی طرح عاصم کو یہ فون دیکر آؤ۔ میرا اُس سے بات کرنا ضروری ہے۔''اُس نے ایک موبائل اپنے خاص بندے کو پکڑاتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا۔ اُسکے بہت تعلقات تھے، اونچی اونچی جگھوں پر پہنچ تھی۔ جیل میں موبائل پہنچانا تو بہت آسان کام تھا۔

''اُس لڑکی صنوبر کے موبائل سے کچھ ملا؟''اس نے اپنے دوسرے آدمی سے پوچھا۔ صنوبر کے مرنے کے بعد سے اُسکا موبائل انکے پاس بند پڑا ہوا تھا۔

''زیادہ کچھ تو نہیں! لیکن کسی لڑکے سے اُسکی کافی بات چیت تھی۔''اُس نے کہا تو وہ ٹھٹکا۔

''کیسی بات چیت؟''

''کام کے حوالے سے ہی تھی، لیکن صرف ایک یہی لڑکا ہے، جس سے اُس نے بات کی ہوئی ہے۔''اُس نے بتایا۔

''دیکھتے ہیں۔۔۔''اس نے کہا تو وہ بھی سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا۔

اگلے روز جب اُس نے جیل میں عاصم کو فون کیا تو وہ غصّے میں بھرا بیٹھا تھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟ تم مجھے اِس طرح بیچ راستے میں اکیلا چھوڑ دو گے؟'' وہ چیخا تھا۔

''چلاؤ مت عاصم! یہ تمہاری ہی غلطی ہے۔ بہر حال! میں تمہیں وہاں سے نکال لوں گا۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیسے؟ کیسے نکالو گے؟''اُس نے کہا۔

''دیکھو! ایک لڑکا ہے، جس سے صنوبر نے کافی بات چیت کی ہوئی ہے۔ میں نے کل اُسکے بارے میں معلومات اکھٹی کروائی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے، بڑا بھائی سیکنڈ لیفٹیننٹ ہے۔ وہ صنوبر کا دوست تھا۔ نوید نام ہے اُسکا۔''

''تو؟''عاصم کو ان باتوں میں قطعاً دلچسپی نہ تھی۔

''تو یہ کہ ہم اُس لڑکے کو پھنسا سکتے ہیں۔''اُس نے کہا۔

''اُس سے کیا ہو گا؟میرے اوپر سے جرم نہیں ہٹے گا۔''عاصم کو اُسکی دماغی حالت پر شک ہوا۔

''مجھے تمہیں جیل سے نکلوا کر غائب کروانے کا موقع مل جائیگا۔میڈیا پر ہم اُس لڑکے کو مشکوک بنادیں گے۔لوگوں کی توجہ بھی تم پر سے ہٹ جائیگی۔''اُس نے منصوبہ ترتیب دیا۔

''مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں آرہی۔۔۔مجھے کوئی سروکار نہیں ہے اُس لڑکے سے،جسکا۔۔۔کیا نام بتایا ہے ابھی تم نے؟''وہ یکدم ہی رکا۔

''نوید۔۔۔نوید عالم!''اِس نام پر عاصم چند لمحے خاموش رہ گیا۔

''کیا ہوا؟تم جانتے ہو کیا اُسے؟''اظہر نے پوچھا۔

''نہیں!''اُس نے فون کاٹ دیا۔نوید عالم وہی شخص تھا،جو اُسکے جرم کا چشم دید گواہ تھا۔اظہر یہ بات نہیں جانتا تھا،پر عاصم جانتا تھا۔

اگلے روز عاصم نے اُسی موبائل سے نوید کو فون کیا۔نمبر اُس نے اپنے ایک دوست سے حاصل کر لیا تھا۔اُسکے بہت سے تعلقات جیل میں بھی اُسکے لیے کام کر رہے تھے۔اُس کے ذہن میں اظہر سے اچھا منصوبہ تھا۔اُس نے نوید کو فون کر کے دھمکایا کہ وہ گواہی واپس لے لے، ورنہ وہ سارا الزام ثبوتوں کے ساتھ اُسکے سر پر ڈال دیگا۔اور نوید اُسکی دھمکیوں میں آگیا۔

اِس سے قبل کہ اگلی پیشی ہوتی،عاصم کے اِس کارنامے کی خبر اظہر کو ہو گئی۔

''تم نے یہ کیا کیا عاصم؟تم اُسے فون کیسے کر سکتے ہو؟تم نے سب خراب کر دیا ہے۔''وہ چلا رہا تھا۔

''میں نے ٹھیک کیا ہے،وہ لڑکا مقدمے سے پیچھے ہٹ جائیگا۔''

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ لڑکا مقدمے کا گواہ ہے؟اور سن لو!اُس کے پیچھے ہٹنے سے کچھ نہیں ہو گا،کچھ بھی نہیں۔۔۔باقی چار گواہ اور بھی ہیں۔اُنکی گواہی بھی کافی ہے۔اور ذرا سوچو!اگر اُس نے تمہاری کال ریکارڈ کر لی ہو تو؟''

''تو میں کیا کروں؟''عاصم دھاڑا تھا،جیل میں رہ رہ کر شاید وہ ذہنی طور پر گھٹ رہا تھا۔

''میں کیا کروں پھر؟ میں چار ماہ سے جیل میں ہوں اور تم صرف تسلیاں دے رہے ہو۔ میری پارٹی بھی میرے لیے کچھ نہیں کر رہی، میری بات غور سے سنو اظہر! اگر تم نے کل تک مجھے مقدمے سے بری نہیں کروایا تو میں بتادوں گا کہ دوسرے مجرم تم ہو۔'' یہ کہہ کر اُس نے فون دور پھینکا تھا۔ وہ غصّے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اُسکے سامنے والے کمرے میں موجود ایس ایچ او کا فون بجا۔ اور کچھ دیر میں وہ عاصم کے سامنے تھا۔ اِس سے قبل کے عاصم کچھ سمجھتا، اُس نے اُسکے سینے میں گولی مار کر اُسے ختم کر دیا۔

''اسکی لاش کو ٹھکانے لگاؤ، میڈیا پر خبر دو کہ یہ طبعی موت مر گیا ہے۔ جھوٹی پوسٹ مارٹم اور فرانزک بھی تیار کرواؤ۔'' وہ اپنے ساتھ کھڑے لوگوں کو حکم دیتا چلا گیا تھا۔

اظہر یہ نہیں چاہتا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہاں تک آنے کے لیے اُسے اپنے ہر ممکن تعلقات لگانے پڑیں گے۔ لیکن عاصم کی جلد بازی کی وجہ سے اُسے یہ کرنا پڑا تھا۔

اور پھر اپنے آپ ہی مقدمہ بند ہو گیا۔

وہ اُن لوگوں سے کبھی نہ مل سکا، جنہوں نے اُس کے خلاف گواہی دی تھی۔

----------+---------+--------

''کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟'' ایک سوال۔۔۔ پوچھنے والا بھی ایک۔۔۔ پر جواب دہندہ تین عورتیں تھیں۔

پہلی ایمان تھی۔۔۔

جس روز اُسکا حور عین سے رشتہ طے ہوا وہ اُسی روز سے سخت بیزار تھا۔ وہ پہلے ہی ایک منگنی ختم کرنے کا باعث بنا تھا، لہٰذا اب اُسکی والدہ اِس معاملے میں اُسکی سننے پر تیار نہ تھیں۔ اُسے حور عین کے بچپنے سے مسئلہ نہیں تھا۔ اُسے مسئلہ اُسکی ذہانت اور تیزی سے تھا۔ وہ جانتا تھا حور عین جیسی لڑکی اُسکے روز و شب کے معمولات کو جلد جانچ لے گی۔ لیکن اُسے یہ بھی سمجھ نہ آ رہا تھا کہ والدہ کو کیسے منع کرے؟ سو باتوں کی ایک بات، اُسے اپنی ماں سے محبت تھی۔ اور ماں کو بھی اُسکی پسند ناپسند پر کوئی اعتراض نہ تھا، وہ کسی کو بھی پسند کر لیتا وہ راضی ہو جاتیں۔ اُنہیں بس! اُسکی شادی کرنا تھی۔

اِنہی دنوں اُس نے محسوس کیا کہ حور عین اُس سے بہت زیادہ سوالات کرنے لگی ہے، اُسکے کام کاج کے حوالے سے، اُسکی دلچسپی اور معمولات کے حوالے سے۔ اور اُسی لمحے وہ سمجھ گیا کہ اِس لڑکی کے ساتھ اُسکا گزارا نہیں ہو سکتا۔ وہ اُس سے جان چھڑانے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا، چاہتا تھا کہ وہ خود منع کر دے۔ اپنی ماں کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اِس بار، لیکن ماں کی ناراضگی سے اوپر اُسکی ساکھ تھی، اور وہ طاقت تھی، جسکا وہ حال ہی میں نیا وارث بنا تھا۔

اِس سے پہلے کہ وہ خود انکار کرتا، اُسکی ملاقات ایمان سے ہوئی۔ ایمان ایک ایسی لڑکی تھی جو اپنے کام سے کام رکھتی تھی، اُسکے بڑے بڑے خواب تھے، وہ اُنکے پیچھے پاگل تھی۔ اُس نے ایک بار بھی اظہر سے اُسکے بارے میں نہیں پوچھا، حتیٰ کہ وہ خود اپنے منگیتر حسین کے معمولات میں بھی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ بس! اسی لمحے اُسے احساس ہوا کہ یہی وہ لڑکی ہے، جو اُسکی خاندانی بیوی بننے کے لائق ہے۔ اپنی شخصیت پر اُسے پورا بھروسہ تھا، وہ جانتا تھا کہ اُسکے سامنے کوئی بھی لڑکی حسین جیسے لاابالی کو پسند نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اُس نے ایمان سے دوستی بڑھائی۔ پہلی بار مال کے فوڈ کورٹ میں اتفاقیہ ملنے کے بعد وہ جان کر اُس سے ملنے لگا، اُسکے دل میں یہ خیال ڈالنے لگا کہ حسین اُسکے لائق نہیں ہے۔ اور ایمان بھی اُسکی محبت کے جال میں بڑے آرام سے آگئی۔ اُس نے اظہر کے کہنے پر اپنے گھر والوں سے صاف صاف بات کی، پر اُنہوں نے بھی صاف صاف انکار کر دیا۔ اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اُسے سخت برا بھلا بھی کہا جو شادی سے چند روز قبل یہ باتیں کر رہی تھی اور وہ بھی حور عین کے منگیتر کے بارے میں۔ اظہر کے لیے تو ویسے بھی کوئی مسئلہ نہ تھا، اُس نے ایمان کو کورٹ میرج کے لیے راضی کر لیا۔ اُس نے بھی حسین کے گھر فون کر کے شادی سے انکار کر دیا، اور خود گھر چھوڑ کر اظہر کے ساتھ فرار ہو گئی۔ اُسکے گھر والوں نے اُس سے تعلقات ختم کر لیے۔ البتہ اظہر کی والدہ بس چند دن ناراض رہ کر مان گئیں۔ اظہر کے لیے یہ اور بھی اچھا تھا کہ ایمان کے گھر والوں نے تعلقات ختم کر دیے ہیں، ورنہ اُسے انکے سوالات بھی جھیلنا پڑتے۔ وہ ایمان کو لے کر بیرونِ ملک آگیا۔ اُسے یہاں کی بہترین یونیورسٹی میں داخل دلوایا، اسے اُسکا خود کا کاروبار کھول کر دیا اور اُسے اتنا مصروف کر دیا کہ وہ اظہر کے بارے میں کبھی جان ہی نہ پائی۔ اظہر نے بھی اُسکی نظروں میں خود کو ایک پرفیکٹ شوہر بنا رکھا تھا۔

شادی کے کچھ عرصے بعد اُسکا یہ تمام ناجائز کاروبار مزید پھلنے پھولنے لگا، پاکستان میں اُسکے لیے یہ تمام کام فرح کر رہی تھی۔ وہ بہت ذہین اور چالاک لڑکی تھی۔

''میں؟ تم سے شادی کروں؟ کیوں؟ تمہارے بنا ہی میری زندگی بہت پر سکون ہے۔'' جب ایک روز اُس نے وہی سوال فرح سے کیا تو وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''کاروباری شادی!'' اُس نے جواب دیا تو فرح نے بھنویں اُچکائیں جیسے جواب پسند آیا ہو۔

''تم بہت سمجھدار عورت ہو۔ ذہین، چلاک اور بیک وقت سفاک بھی۔ سب سے اچھی بات، میرے گروہ کے ساتھ وفادار بھی ہو۔ اگر تم مجھ سے شادی کرلو گی تو تمہیں برطانوی شہریت مل جائیگی، پاکستان اور وہاں دونوں طرح سے تمہارا کام آسان ہو جائیگا۔ اور میری بیوی ہونے کی حیثیت سے کافی جگہوں پر تمہارے لیے آسانی ہو جائیگی۔ اور یہاں موجود میرے تمام پارٹنرز کو تم بطور میری بیوی کی حیثیت سے ڈیل بھی کر سکتی ہو۔ میں پاکستان میں ہونے والا اپنا تمام کام تمہارے سپرد کر دوں گا، اسطرح میرے سر سے بھی بوجھ کم ہو گا۔''

''ہونہہ! پر اِس میں تو صرف تمہارا فائدہ ہے؟'' اُس نے ابرو اُچکائی۔

''تو تم اور کیا چاہتی ہو؟'' وہ دلچسپی سے بولا۔

''میں یہاں اپنا خود کا گھر، چھوٹا موٹا کاروبار، ذاتی بینک اکاؤنٹز اور ایک اچھی سرکاری نوکری چاہتی ہوں۔''

''بس! اتنا ہی؟'' وہ طنزیہ ہنسا۔

''کیوں کم ہے کیا؟'' وہ بھی مصنوعی معصومیت سے بولی۔

''کاروبار؟ یا سرکاری نوکری؟'' اُس نے فرح کو دو میں سے کوئی ایک چننے کو کہا۔

''دونوں! سرکاری نوکری اپنے تعلقات وسیع کرنے کے لیے اور کاروبار اپنے بوڑھے ماں باپ کی زندگی بہترین اور آسائشات سے پُر کرنے کے لیے۔'' وہ جوس کا گلاس لبوں سے لگاتی بولی۔

''تمہاری یہ بات مجھے پسند ہے۔ تم صاف اور سیدھی بات کرتی ہو۔'' اُس نے ستائش سے کہا اور پیچھے کو ٹیک لگا لی۔

''اور مجھے تمہاری ایک بات بھی نہیں پسند!'' اُس نے صفائی سے کہا تو وہ ہنسا۔

''اگر میں تمہارے مطالبات نہ مانوں تو؟''

''تو کیا؟ میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔''اُس نے کندھے جھٹکتے کہا۔ ''مجھے تم سے شادی نہ کر کے کوئی فرق نہیں پڑتا، پر تمہیں پڑتا ہے۔ تمہیں میری ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے! مجھے منظور ہے۔ لیکن میرے خاندان تک یہ بات نہیں پہنچنی چاہیے کہ تم میری دوسری بیوی ہو۔'' وہ راضی ہو گیا۔

''ڈیل!'' وہ راضی ہو گیا۔

اُسکے بعد دونوں نے قانوناً شادی کر لی، فرح کو ویسے بھی اُس سے یا اُسکے خاندان سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اظہر یہاں رہے یا باہر، اُسے بس دولت سے مطلب تھا۔ فرح سے شادی کر کے وہ بہت مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ بڑے بہترین طریقے سے اُسکے غیر قانونی کاموں کو پاکستان میں سرانجام دے رہی تھی۔

انہی دنوں اُسکا پاکستان آنا ہوا تو اُسکی ملاقات اتفاقیہ طور پر فاطمہ سے ہوئی۔ اور وہ ساکت رہ گیا۔ اُسے یہ ماننے میں کوئی عار نہ تھی کہ اُسکی پہلی پسند ہمیشہ سے فاطمہ ہی تھی، ایمان نہ ہوتی تو وہی اُسکی زندگی میں ہوتی۔ لیکن اب؟

اب نہیں۔۔۔ اظہر الدین تقی کا ایک مسئلہ تھا۔ وہ بدلے کی آگ میں جلنے والا ایک نفسیاتی تھا۔ وہ طاقت کا دلدادہ تھا۔ اُسے لوگ اپنے قدموں میں پسند تھے، جبکہ فاطمہ نے اُسے ٹھکرایا تھا۔ اور یہ بات اُسے کبھی نہیں بھولی تھی۔ وہ بدلے کی خاطر پورا پورا منصوبہ ترتیب دینے والا شخص تھا۔ اُس نے اُس پارٹی میں فاطمہ کو حسرت بھری نگاہوں سے اپنی دوستوں کو دیکھتے، دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اُسے کیسے راضی کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا اُس نے ہر طرح سے اُسے اپنے جال میں پھنسایا کہ وہ اِس میں ماہر تھا۔ اور وہی ہوا، جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے، فاطمہ راضی ہو گئی۔ پہلے اُسکا ارادہ تھا کہ وہ اُسکی علی سے طلاق کے بعد ہی اُسے چھوڑ دے گا، تاکہ وہ تاعمر پچھتائے اور واپسی کا کوئی راستہ بھی اُسکے پاس نہ ہو۔ لیکن پھر اُسکے دماغ میں ایک منصوبہ آیا۔ اُس نے اپنا ناجائز دھندہ مشرق وسطی میں شروع کیا تو لڑکیوں کو نشہ فراہم کرنے کے لیے اُسے ایک عورت کی ضرورت تھی۔ فرح پاکستان میں تھی، اُسے وہ، وہاں نہیں بلا سکتا تھا۔ فاطمہ جیسی لڑکی کو قید کر کے، اُسکی بیٹی کو یرغمال بنا کر اُس سے زبردستی یہ کام لینا آسان تھا۔ لہٰذا اُس نے اُس سے بھی شادی کر لی۔

چھے سالوں میں یہ اُسکی تیسری شادی تھی،اوران سب کے دوران وہ ایمان کو وقت دینا نہیں بھولتا تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے ذرا بھی شک ہواور وہ ویسے بھی اظہرپر اندھا بھروسہ کرتی تھی۔ مسئلہ تب کھڑا ہوا،جب ایک ایس ایس پی نے فرح کے قریب رہ کر اُسکی تمام معلومات اکھٹی کرلیں۔

''تم اتنی بڑی بیوقوفی کیسے کرسکتی ہو؟''اُس نے آتے ساتھ ہی اُسکے چہرے پر تھپڑ جڑا تھا۔وہ اُسکی بیوی نہیں تھی،صرف ایک ایمپلوئے تھی۔

''میں نے اتنے عرصے میں یہ پہلی غلطی کی ہے اظہر!''وہ چلائی۔

''لیکن اِس غلطی کا انجام جانتی ہو تم؟اگر کچھ بھی برا ہوا تو میں تمہیں یہیں دفن کردوں گا۔''اُسکا غضب عروج پر تھا۔

''میرا ایک بندہ ایف آئی اے میں ہے۔اُس نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اُس نوید نامی شخص نے تمام معلومات کہاں چھپا رکھی ہیں۔مجھے ایک دن کا وقت دو میں سب ٹھیک کرلوں گی۔''پہلی بار وہ ڈری تھی۔

''ٹھیک ہے!صرف ایک دن ہے تمہارے پاس۔اگر اِس بار کوئی غلطی ہوئی،تو تمہارے ساتھ تمہارے ماں باپ بھی مریں گے۔''وہ سرد لہجے میں کہتا کمرے میں چلا گیا۔ فرح کے اپنے بھی بہت تعلقات تھے۔اُس نے نوید کے آفس میں چھپ کر گھسنے کا منصوبہ بنایا۔اُس کا ارادہ نوید کے آفس کو آگ لگانے کا تھا۔اُس نے سب سے پہلے ایک بہترین ہیکر کے ذریعے اُس کے آفس کا پاسورڈ ہیک کیا،وہ دروازہ پاسورڈ سے کھلتا تھا۔اُس روز،جب اُسے معلوم تھا کہ آج نوید آفس نہیں آئے گا،وہ وہاں کی تلاشی کا ارادہ رکھتی تھی۔لیکن اسکی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے نوید کو اُسکے گھر والوں کے ساتھ وہاں آتے دیکھا۔تب ہی اُس کے دماغ نے کھڑے کھڑے وہ منصوبہ ترتیب دیا۔سارے سی سی ٹی وی وہ پہلے بند کرواچکی تھی۔

وہ وہاں سے واپس آگئی،عمارت کے احاطے میں ہی کھڑے ہو کر اُس نے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے انسانی ہڈیاں منگوائیں،جو ایک نو عمر بچے کی تھی۔اُن کے پاس انسانی اعضاء اور ہڈیاں باآسانی دستیاب رہتی تھیں۔پھر جب اُس نے نوید کو کسی کام سے نیچے آتے دیکھا تو وہ اوپر پہنچ گئی،نوید نیچے نہ بھی آتا تب بھی وہ اُسے وہاں سے ہٹانے کا طریقہ سوچ چکی تھی،لیکن اُسکی نوبت نہ آئی اور وہ خود ہی کسی سے ملنے چلا گیا۔

پیچھے اُس نے آفس میں قدم رکھے، بشریٰ کو بالکنی میں کھڑا دیکھ کر ولید کو گود میں اٹھایا اور اپنی چادر میں چھپا دیا، پھر اُسکے کاٹ میں ہڈیاں ڈال کر خاموشی سے بالکنی کا دروازہ بند کر دیا۔ دروازے کی آواز پر بشریٰ نے پلٹ کر دیکھا۔ پر اب وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے نوید کے آفس کو آگ لگائی اور دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

اُسکے بعد فوری طور پر اُس نے کسی شیلٹر ہوم یا یتیم خانے جانے کی بجائے رضا کی پناہ گاہ کو چنا، اُسے ایک جھوٹی کہانی سنا کر اُسکے ہمدرد دل کا فائدہ اٹھایا اور ولید کو وہاں رکھوا دیا۔ درمیان میں وہ وقتاً فوقتاً اُسے اپنے گھر لیکر آتی رہتی تھی تاکہ رضا کو شک نہ ہو۔ اظہر اُسکی کارروائی سے مطمئن ہو چکا تھا، حالانکہ نوید کے بھائی نے اُسے عدالتوں میں ٹھیک ٹھاک گھسیٹا تھا، لیکن فرح کی دو شناخت کی وجہ سے ایک شناخت پر شادی ثابت نہیں تھی، لہٰذا اظہر تو کسی معاملے میں پھنسا ہی نہیں۔ اور پھر نوید کے پاس کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے مقدمہ بھی ہر حال میں بند ہی ہونا تھا۔

لہٰذا وہ بڑے سکون سے اپنا کام کرتا رہا تھا۔

----------+---------+--------

''ایمان! تم ٹھیک ہو؟'' حسین نے اُسکے قریب آکر پوچھا تھا۔

''حسین۔۔۔ حسین دیکھو! یہ لوگ اظہر کو گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔ اُس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ تو ایک اچھا، شریف انسان ہے۔'' وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔

''ایمان! تم فکر نہ کرو۔ تم نے کچھ نہیں کیا ہے، تمہیں یہ لوگ چھوڑ دیں گے۔'' اُس نے دکھ سے کہا۔

''مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ اظہر نے بھی کچھ نہیں کیا، انکو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ رو رہی تھی۔ اُسے بالکل یقین نہ تھا کہ اظہر مجرم ہو سکتا ہے۔

''میں ماموں سے بات کرتا ہوں، وہ تمہیں یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ ہم تمہاری ضمانت۔۔۔''

''تم میری بات کیوں نہیں سن رہے؟'' وہ اُسکی بات کاٹتے ہوئے چیخی۔ حسین نے افسوس سے اُسے دیکھا۔

''ایمان! اظہر مجرم ہے۔ بہت بڑا مجرم۔۔۔۔فرعون سے بھی بدتر ہے وہ، سینکڑوں لوگوں کا قاتل ہے۔'' حسین نے سمجھانا چاہا تھا۔

''جھوٹ۔۔۔ جھوٹ بول رہے ہو تم۔۔۔ تم بھی اِنکی باتوں میں آ گئے ہو۔'' وہ چلارہی تھی اور وہ بس اُسے تاسف سے دیکھ رہا تھا۔ اُسی لمحے اظہر کو اُسکے سامنے سے لے جایا جانے لگا۔

''اظہر! اظہر۔۔۔'' وہ بھاگتی ہوئے اُسکے پاس آئی تھی، اُسکے پیچھے کچھ اہلکار بھی آئے تھے۔ اُسے روکنا چاہتے تھے پر نوید نے اشارے سے روک دیا۔ اور یہی اُسکی سب سے بڑی غلطی تھی۔

''اظہر تم۔۔۔ تم نے کچھ نہیں کیا مجھے معلوم ہے۔ یہ لوگ کیوں لیکر جارہے ہیں تمہیں؟'' وہ اُسکا ہاتھ تھامتی گڑگڑائی۔ حسین دکھ سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُسکے چہرے پر کرب کے آثار دیکھ کر عمر اُسکے پاس آیا اور اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے اُسے تسلی دی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا ایمان! یہ سب۔۔۔ یہ سب۔۔۔'' وہ کہتے کہتے رکا اور پیچھے کھڑے حسین کو دیکھا، جسکی یہاں موجودگی کا کوئی جواز وہ سمجھ نہ سکا تھا۔

''یہ سب اِس حسین کے لگائے گئے الزامات ہیں۔'' اُس نے یکدم ہی کہا تو حسین نے ایک لمحے ناسمجھی سے اُسے دیکھا، جیسے اُسکا دماغ سمجھ نہ سکا ہو کہ اُس نے ابھی کیا کہا ہے۔

''کیا؟'' ایمان نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

''اس نے اپنے ٹھکرائے جانے کا بدلہ لیا ہے مجھ سے۔۔۔ اتنے سنگین الزامات لگا کر۔'' اُس نے کہا اور بڑی طنزیہ نظروں سے حسین کو دیکھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' حسین غصّے سے آگے بڑھا، عمر نے اُسے بازو سے تھام کر روکا۔

''یہی سچ ہے۔۔۔ اور یہ بات تم اپنے گھر والوں کو ضرور بتانا ایمان!'' وہ جاتے جاتے حسین کی زندگی میں آگ لگانے پر تیار تھا۔ اِس سے قبل کہ وہ مزید کچھ کہتا، نوید کے اشارہ کرنے پر اہلکار اُسے گھسیٹتے ہوئے ساتھ لے جانے لگے۔

''اِسے چھوڑنا مت ایمان! میری زندگی برباد کرنے کا بدلہ اِس سے ضرور لینا۔'' وہ چیخ چیخ کر کہتا اُسکے ذہن میں زہر گھول رہا تھا۔ جبکہ وہ ساکت و جامد کھڑی تھی۔

''لے کر جاؤ اِسے یہاں سے۔۔۔'' ساگر نے سختی سے کہا تو اُسے وہاں سے لے جایا گیا۔

''انہیں بھی تفتیشی کمرے میں لیکر جاؤ۔'' نوید نے اظہر کے گھر والوں کے بارے میں بھی سنجیدگی سے ہدایت دی تھی۔

''چلیں میڈم!'' ایک اہلکار نے ایمان سے کہا تو اُسکے وجود میں جنبش ہوئی، وہ اُس اہلکار کی جانب مڑی اور کسی کے بھی کچھ سمجھنے سے پہلے اہلکار کی بیلٹ میں موجود پستول نکال کر اُسے دھکّا دیا۔ اُسے پستول پکڑنے یا چلانے کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ بس چند مرتبہ اظہر کے ساتھ کلب میں جا کر پستول پکڑنا سیکھا ضرور تھا، پر نشانہ اُسکا زیادہ اچھا نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اُس نے پستول کا رخ حسین کی جانب کیا تھا۔

''روکو اُسے۔۔۔'' ساگر چیخا تھا، اہلکار الٹا خود کو بچاتے دوسری جانب ہوا تھا۔ اِس اچانک افتاد پر سب بوکھلائے تھے۔

''حسین پیچھے ہو۔۔'' عمر اُسے پیچھے ہٹانے لگا۔

''اگر کوئی بھی آگے بڑھا تو میں سب کو مار دوں گی۔'' اُس نے دونوں ہاتھوں سے پستول تھامے اُن سب کو دھمکی دی، وہ کوئی جنونی لگ رہی تھی۔ یہ وہ ایمان تو نہ تھی، جسکی خاندان میں سب مثالیں دیتے تھے۔

''تم لوگ اندر جاؤ!'' نوید باقی سب کو پیچھے ہٹانے لگا، اُسکی گود میں موجود ولید آوازوں سے ڈر کر اٹھا اور رونے لگا۔ اِس وقت ایمان کو روکنے سے زیادہ ضروری خود کو بچانا تھا، وہ بنا کچھ دیکھے گولی چلا سکتی تھی۔ ''اِسے پکڑو!'' نوید نے ولید کو رضا کی گود میں دیا اور اپنی پستول نکالی۔

''نہیں نوید!'' حسین کے لب ہلے، اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے اشارہ کیا۔ پر نوید نے ایمان پر پستول تان لی تھی۔

''اپنی پستول نیچے کرو اور خود کو قانون کے حوالے کر دو۔'' نوید نے سختی سے اُسے مخاطب کیا تھا۔ اُسکی لغت میں مجرمین کا کوئی جنس تھا نہ اُنکے لیے کوئی نرمی تھی۔

''ورنہ؟ کیا کر لوگے تم؟'' اُس نے دھمکی آمیز انداز میں پوچھا۔

''مجھے مجبوراً تمہیں مارنا پڑے گا۔''اُس نے سرد لہجے میں کہا۔

''نہیں نوید! رک جاؤ۔۔۔میں بات کرتا ہوں اِس سے۔۔'' حسین آگے بڑھا۔وہ آگے ہوا تو مجبوراً عمر کو بھی اُسکے ساتھ آنا پڑا۔

''وہیں رک جاؤ!'' ایمان چلائی تو وہ رکا۔''میرے شوہر کو چھوڑ دو، میں کسی کو کچھ نہیں کہوں گی۔''وہ شاید واقع پاگل ہو چکی تھی، حسین کو اُسکی دماغی حالت پر شک گزرا تھا۔

''میں بھی تمہیں بالکل آخری بار کہہ رہا ہوں۔اِسے نیچے پھینک دو!''نوید کے لہجے میں کوئی لچک نہ تھی۔

''ٹھیک ہے! ایسے ہے تو ایسے ہی صحیح!''اور پھر اُس نے وہ کیا، جس کی کسی کو کوئی اُمید نہ تھی۔اگلے ہی لمحے اُس نے بلااشتعال پستول چلائی تھی۔جبکہ سب یہی سمجھے تھے کہ وہ صرف دھمکی دے رہی ہو گی۔

''حسین!''، مقدم، رضا اور علی ساتھ چلائے تھے۔نوید سمجھ نہ سکا کہ گولی چلائے یا نہیں! وہ فقط دھمکی دے رہا تھا۔اُسے اُمید نہ تھی کہ وہ گولی چلادے گی۔اگلے ہی لمحے وہ جان پر کھیلتے ہوئے اُسکے قریب گیا تھا، لیکن تب تک وہ اندھادھند پستول خالی کر چکی تھی، نوید نے اُسکے ہاتھوں سے پستول چھینی ہی تھی اور پھر۔۔۔

جاگتی آنکھوں نے ایک منظر دیکھا۔۔۔

سنتے کانوں نے وہ آواز سنی۔۔۔۔

دو زمین بوس ہوتے وجود کی آواز۔۔۔

بہتے لہو کا رنگ دیکھا۔۔۔۔

ہر شے جیسے رک گئی تھی۔جو جہاں تھا وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ حسین ایک جانب گرا تھا، تو عمر دوسری جانب کھمبا پکڑ کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔

کوئی بھاگتا ہوا حسین تک گیا تھا، تو کوئی دوڑتا ہوا عمر کے پاس آیا تھا۔

ایک شے جو دونوں جانب موجود تھی۔۔۔

وہ لہو تھا۔۔۔

حسین کا بہتا لہو۔۔۔

عمر کا بہتا لہو۔۔۔

دونوں کا خون زمین پر پھیلتے ایک مقام پر گڈ مڈ ہو رہا تھا۔۔۔

کیا کیا نہیں یاد آیا تھا اِس لمحے؟ اُس کے بچے، جن سے ملنے کے لیے وہ بے تاب تھا۔۔۔۔

عمر کے ماں باپ جن سے وہ ایک بار پھر جھوٹ بول کر آیا تھا۔۔۔

سب پیچھے رہ گیا تھا۔۔۔

آوازیں، سماعتیں، نگاہیں۔۔۔

سب مفلوج ہو گئی تھیں۔۔۔۔

--------+---------+----------

ہسپتال کا سفید فرش۔۔۔

سفید دیواریں۔۔۔

دواؤں کی بو۔۔۔

روتے لوگ۔۔۔

پریشان چہرے۔۔۔

دعاؤں کے لیے اٹھتے ہاتھ۔۔۔

آپریشن تھیٹر کی جلتی لال بتی۔۔۔

اور منتظر نگاہیں۔۔۔

ہسپتال اُسے کبھی پسند نہیں آیا تھا۔ رضا، مقدم اور علی۔۔۔

تین نفوس کی موجودگی میں بھی جامد سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ مقدم بے چینی سے دائیں سے بائیں، اور بائیں سے دائیں چکر کاٹ رہا تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ دونوں میں سے کس کے لیے دل زیادہ تڑپ رہا ہے۔ رضا پتھرائی نگاہوں سے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ اور علی سر تھامے بیٹھا تھا۔ جتنا اُنہیں انتظار تھا کہ یہ سب ختم ہو جائے، اتنا وہ کسی نہ کسی مسئلے میں پھنستے جا رہے تھے۔ جیسے کوئی دلدل ہو، جہاں سے نکلنا ممکن نہ ہو۔

فجر کی اذانیں ہو چکی تھیں، وہ نماز پڑھ کر۔ اپنے دونوں دوستوں کے لیے ڈھیروں دعائیں مانگ کر واپس آئے تو روشنی ہو چکی تھی، پر آپریشن تھیٹر کا دروازہ نہ کھلا تھا۔ نوید بھی اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

پھر۔۔۔

آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔۔۔

رضا کی پتھرائی آنکھوں میں جنبش ہوئی۔۔۔

علی فوراً کھڑا ہوا۔۔۔

مقدم ٹھہر گیا۔۔۔

ڈاکٹر قریب آیا۔ تینوں اُسکے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ پر چہرے پر سوال صاف ظاہر تھا۔

''دونوں پیشنٹس (مریضوں) کی کنڈیشن (حالت) کریٹکل (تشویش ناک) ہے۔'' پہلا ہی جملہ اتنا حوصلہ شکن کیسے ہو سکتا ہے؟ اُسے تو پہلے تسلی دینی تھی نا!

''کیا مطلب کریٹکل ہے؟'' سوال مقدّم نے کیا تھا۔ آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''پیشنٹ عمر! انہیں پانچ گولیاں لگی ہیں۔ بازوؤں پر دو، پیٹ پر ایک، سینے کے قریب ایک اور ایک پاؤں میں۔۔۔ایسا لگتا ہے کسی نے اندھا دھند گولی ماری گئی۔ سینے پر لگنے والی گولی کے باعث دل کے گرد جھلی میں خون جمع ہو گیا ہے۔ ہم اُسے صاف کر رہے ہیں، لیکن دل کی دھڑکن بے ترتیب ہے، پھیپھڑے زخمی ہوئے ہیں، تو سانس لینے میں بھی مسئلہ ہے۔ آپریشن ابھی جاری ہے، خون کی اشد ضرورت ہے۔ اگر آپریشن کے بعد بھی دھڑکن کی رفتار اور سانس معمول پر نہیں آتیں تو ہمیں اُنہیں انتہائی نگہداشت میں رکھنا ہو گا۔''ڈاکٹر تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا یا سر پر ہتھوڑے برسا رہا تھا؟ کیا اُسے پتہ بھی تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟

''وہ بچ جائیگا نا؟''مقدم نے پھر سوال کیا۔اِس بار سوال میں اُمیدیں ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''دعا کریں بس!''بس؟اُس نے اتنا ہی کہا؟ کیا وہ ایک جملہ بھی حوصلہ افزا نہیں کہہ سکتا؟ کیا ایک لفظ بھی نہیں؟

''اور حسین؟''رضا نے پوچھا۔ابھی شاید اور امتحان باقی تھا۔

''انھیں تین گولیاں لگی ہیں، لیکن معاملہ نازک ہے۔''وہ کیا حوصلہ شکنی میں ماہر تھا؟انھیں لگا کسی نے سانسیں روک دی ہیں۔

''سرجری کے دوران معلوم ہوا کہ انکا ایک گردہ نہیں ہے، اور ایک گولی انکے واحد گردے کے قریب لگی ہے، جو اُسے زخمی کر گئی ہے۔''رضا اِس سے زیادہ نہیں سن سکتا تھا۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ باقی دونوں کی تو ہمت بھی نہ تھی اُسکی طرف دیکھنے کی۔

''اُسکا گردہ؟''علی کو لگا شاید سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''اُسکا مسئلہ نہیں ہے، وہ زیادہ زخمی نہیں ہوا ہے۔ جلدی زخم بھر جائینگے لیکن۔۔۔''وہ رکا۔ پہلی حوصلہ افزا بات کے اختتام میں وہ رک گیا۔

''اصل مسئلہ اِس وقت انکا جگر ہے، ایک گولی کندھے پر لگی ہے، جس سے انکے پٹھے متاثر ہوئے ہیں۔ البتہ جگر میں خون بہنا شروع ہو گیا ہے، جسکی سرجری جاری ہے۔ ہم خون روکنے کی کوئی کر رہے ہیں، آپ لوگوں کو دونوں مریضوں کے لیے بہت وافر مقدار میں خون کا انتظام کرنا ہے۔ میں اطلاع دینے آیا تھا، واپس جا رہا ہوں۔ آپ لوگ دعا کیجیے۔''ڈاکٹر واپس اندر چلا گیا۔

''یہ۔۔۔یہ کیا کہہ رہا تھا؟''مقدّم نے ایسے پوچھا جیسے اُسے معلوم ہی نہ ہو کہ ڈاکٹر ابھی کیا کہہ کر گیا تھا۔

''ہمیں خون کا انتظام کرنا ہے۔ میں جارہا ہوں۔''سب سے پہلے علی کے حواس بحال ہوئے تھے۔ وہ اُٹھا اور جانے کے لیے کھڑا ہوا۔

''تم دونوں خود کو سنبھالو! یہ ہوش سے کام لینے کا وقت ہے۔''وہ دونوں کو کہتا باہر نکلا۔ اُسے خون کا انتظام کرنا تھا۔ ہر حال میں۔۔۔ مقدّم نے موبائل جیب سے نکالا، اُسکے ہاتھ میکانکی انداز میں چل رہے تھے۔ اُسے ابھی خون کے عطیات چاہیے تھے، اپنے تمام ممکنہ رابطے استعمال کرنا ضروری تھا۔

رضا نے نم آنکھیں اٹھا کر تھیٹر کو دیکھا۔ اُسکے دو بہت پیارے وہاں زندگی و موت کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ایک مہربان دوست۔۔۔ جو کسی انجان رات اُسکے غم میں برابر کا شریک ہوا تھا۔۔۔ دوسرا محسن۔۔۔ جو ہر لمحے اُسکا غمگسار رہا تھا۔

مقدم اُسکے پاس آ کر بیٹھا۔

''وہ دونوں ٹھیک ہو جائیں گے۔ دیکھنا! جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔'' پتہ نہیں وہ اُس کو تسلی دے رہا تھا یا خود کو؟ پر اس تسلی پر اُسے خود بھی مکمل یقین نہ تھا۔

''حسین کو اپنے بچوں سے ملنا تھا۔ عمر کے ماں باپ اُسکا انتظار کر رہے ہیں۔''وہ دروازہ دیکھتے کہہ رہا تھا۔ مقدّم کی آنکھیں بھی نم ہوئیں۔

''سب ٹھیک ہو جائیگا۔۔۔''وہ تسلی دے رہا تھا۔۔۔ شاید خود کو!

خون کی بوتلوں کا انتظام کرنے کے لیے دوڑتا علی اپنی آنکھوں میں آتی نمی بار بار پیچھے دھکیل رہا تھا۔ اُس نے عمر کے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُسے جیسے لے کر جارہا ہے، ویسے ہی واپس لائے گا۔ وہ اُنہیں کیا جواب دے گا؟ حسین سے تو وہ اب تک معافی بھی نہ مانگ سکا تھا، اُسے گلے بھی نہ لگا سکا تھا۔

اگر قسمت میں اکھٹے ہونا ہی تھا تو پھر ایسے کیوں؟

کیا اب بھی وقت نہیں آیا تھا؟

کوریڈور میں بیٹھے رضا کا فون بج رہا تھا۔ نمبر انجان تھا۔ اُس نے پہلے نظر انداز کیا، پھر کچھ سوچ کر اُٹھا لیا۔

''رضا بھائی !۔۔۔رضا بھائی آپ کہاں ہیں ؟'' دوسری جانب سے آتی آواز سن کراُسکے چھکے چھوٹ گئے۔اُس نے پریشانی سے مقدّم کو دیکھا جو ناسمجھی سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''حو۔۔۔حور عین ! تم۔۔۔کک۔۔۔کیا ہوا؟''اُس نے انجان بننے کی ناکام کوشش کی۔یقیناً اُسکا نمبر اُسے حسین نے ہی دیا ہوگا۔

''رضا بھائی ! آپ حسین کے ساتھ ہیں نا؟'' وہ رو رہی تھی۔

''ہاں ! اُسکے ساتھ ہی ہوں۔''اُس نے جھوٹ بولا۔

''اسکو فون دیں، بات کروائیں میری۔۔۔''اُس نے کہا تو وہ پریشانی سے کھڑا ہوا۔سمجھ نہ آیا کہ کیا کہے۔

''وہ اصل میں۔۔۔۔'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''مجھے بتائیں کیا ہوا ہے حسین کو؟ یہ نیوز میں کیا آرہا ہے؟ کیا ہوا؟ مجھے بتائیں۔۔۔کچھ بولے رضا بھائی ! حسین کیسا ہے ؟'' وہ چیختی چلی جارہی تھی۔

''نیوز میں ؟'' وہ سناٹوں میں رہ گیا۔نجانے دوسری جانب سے کیا کہا جارہا تھا؟ وہ بالکل ساکت تھا۔مقدّم الگ پریشانی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''ہسپتال ؟ بتاتا ہوں۔۔۔'' وہ اُسے ہسپتال کا پتہ بتا رہا تھا۔اُسکے بعد اُسے تسلی دینا چاہتا تھا لیکن اُس نے فون کاٹ دیا۔اب وہ یقیناً یہاں آنے والی تھی۔

----------+---------+--------

''کیسے ؟۔۔۔'' وہ حلق کے بل چیخا تھا۔''کیسے کر سکتے ہو تم سب ؟'' آواز اونچی تھی۔''اتنی بڑی غلطی ؟ اتنی بڑی کوتاہی ؟ اِس نااہلی کی کیا سزا دوں میں تم سب کو؟'' ایس ایس پی نوید عالم سامنے کھڑے عملے پر گرج برس رہا تھا۔عملہ سر جھکائے خاموش تھا۔

''سر ! انہوں نے اچانک سے۔۔۔'' کسی نے وضاحت دینی چاہی۔

''خاموش !۔۔۔''اُسکی دھاڑ پر وہ چپ ہوا، نوید چلتا ہوا اُسکے قریب آیا۔''جب خاتون نے تم سے بندوق چھینی تھی تو تمہیں اپنی جان پر کھیل کر اُسے روکنا تھا۔اور تم نے کیا کیا؟ ہاں ؟'' وہ اُسکے چہرے کے پاس چیخا تو وہ سر جھکائے کپکپانے لگا۔

''تم نے اپنی جان بچانا ضروری سمجھا۔''ایک مرتبہ پھر چیخا تھا۔اُسکے اندر اِس وقت جو آگ لگی تھی،وہ چلا چلا کر ختم بھی ہو جاتا،تب بھی نہ بجھتی۔

''سوری سر!''

''شٹ اپ!''وہ پریشانی سے اپنے بال سہلاتا پیچھے ہٹا اور انہیں ہاتھ سے دفع ہو جانے کا اشارہ کیا۔وہ سر جھکائے اُسکے کمرے سے باہر نکل گئے۔

''نوید!اب بس کرو۔اِن سے مینجمنٹ حساب لے لے گی۔''کافی دیر سے خاموش کھڑے ساگر نے اُسکے قریب آتے ہوئے کہا تھا۔

''ہسپتال سے کوئی خبر آئی؟''اُس نے ساگر سے پوچھا۔نوید نے ایمان کو قابو کر لیا تھا۔اب وہ حراست میں تھی۔حسین اور عمر دونوں ہی گولیوں کی زد میں آئے تھے۔دونوں کو بروقت ہسپتال منتقل کر دیا گیا تھا۔باقی سب بھی ساتھ گئے تھے،لیکن نوید یہیں تھا۔اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈیوٹی پر موجود عملے کا منہ نوچ لے۔

''فلحال تو نہیں!فیصل ساتھ ہی ہے انکے۔تم کیا اظہر سے تفتیش کے لیے چلو گے؟''اُس نے پوچھا۔

''ہاں!اور وہ خاتون ایمان؟''

''وہ فلحال حراست میں ہے۔''

''حسین نہیں چاہتا تھا کہ وہ گرفتار ہو۔''نوید نے پریشانی سے کہا۔

''اب تک تو یہی لگتا ہے جیسے وہ ان سب سے انجان تھی،اور جو اُس نے کیا،جذبات میں آ کر کیا۔''

''نوید!''اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا اُسے اپنے نام کی پکار سنائی دی۔اُس نے پلٹ کر دیکھا تو وحید چلا آ رہا تھا۔فرح کی گرفتاری کے بعد وہ کہیں چلا گیا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟''اُس نے قریب آ کر پریشانی سے اُسے دیکھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔آپ کو یہاں ہونے والے واقعہ کی خبر مل گئی؟''اُس نے پوچھا۔

''مجھ سے پہلے امی کو مل گئی ہے۔ وہ الگ پریشان ہیں، بشریٰ بھی بار بار پوچھ رہی ہے۔''اِس بات پر تو دونوں بھونچکارہ گئے۔

''کیسے ؟''ساگر کے منہ سے نکلا۔

''میڈیا۔۔۔میڈیا یہاں تھا۔ جو ہوا اُسکی خبر ہر جانب پھیل چکی ہے۔اپوزیشن جماعتیں حکومت سے واقعے کا نوٹس لینے کا مطالبہ کررہی ہیں۔''اُس نے بتایا۔

''ایک تو یہ میڈیا!''ساگر نے پریشانی سے ماتھا مسلا۔

''اب ایمان کا کیا ہوگا؟''

''ایمان کون ؟''وحید نے پوچھا۔

''جس نے فائرنگ کی ہے۔''ساگر نے کہا۔

''کیا ہوگا بھلا؟''وحید نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔''اُس پر اِقدام قتل کے تحت مقدمہ چلایا جائیگا۔ وہ اظہر کے جرم میں شریک ہو یا نہ ہو، پر کچھ دیر قبل جو اُس نے کیا وہ سراسر جرم ہے۔''سنجیدگی سے کہتے ہوئے وحید نے صوفے کی جانب دیکھا، جہاں ولید سکون سے سویا ہوا تھا۔

''کیا اسے گھر نہیں لے جانا؟''اُس نے پوچھا، تو نوید نے اُس کی جانب دیکھا۔ چہرے پر یکدم ہی نرمی چھائی۔

''میں خود لیکر جانا چاہتا ہوں۔''آہستہ سے کہا، تو وحید نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں پہلے اظہر سے تفتیش کے لیے جاؤں گا۔ پھر ہسپتال۔۔۔اسکے بعد اُسے گھر لے جاؤں گا۔''اُس نے کہتے ہوئے اپنا موبائل دیکھا۔ بشریٰ کے علاوہ کسی کا میسج نہ تھا۔اُس نے بشریٰ کو تسلی آمیز پیغام بھیجا۔ پھر موبائل رکھ کر وحید کو دیکھا جو اب صوفے پر سوئے ولید کا سر سہلاتے اُسے پیار سے دیکھ رہا تھا، وہ مسکرایا۔

''ہمیں تفتیش کے لیے چلنا ہے۔''ساگر نے یاد دلایا۔

''ٹھیک ہے چلو!''وحید کھڑا ہو گیا۔

''آپ بھی چلیں گے؟''نوید نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! میں بھی اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اسکا خیال رکھنا، میں آرہا ہوں۔''نوید نے ولید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے بھروسے کے آدمی کو اُسکے پاس چھوڑا، اُسکے بعد وہ تینوں ہی تفتیشی کمرے میں موجود تھے۔

''کچھ بتایا اِس نے؟''اُس نے کمرے میں موجود شیراز سے پوچھا۔

''کافی کچھ!''اگر شیراز کے چہرے پر غضب کی سنجیدگی نہ ہوتی تو وہ لوگ اُسے یقیناً مذاق سمجھتے۔

''کیا مطلب؟''ساگر نے پوچھا۔

''یہ اپنے جرائم کا اعتراف کر رہا ہے۔اور وہ بھی بڑی ڈھٹائی سے۔۔۔''اُس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا تو تینوں نے ساتھ اظہر کو دیکھا۔ جو بڑے سکون سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔اُسکے چہرے پر شرمندگی کا شائبہ تک نہ تھا۔

''تم۔۔''نوید دونوں ہتھیلی میز پر رکھتے جھکا، اور اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔''تم اب کیا کروں گے ہاں؟''اُس نے چبا چبا کر پوچھا تو جواباً وہ ہنسا۔

''تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، میرے کلائنٹس صرف تمہارے ہی نہیں، بلکہ آس پڑوس کے ممالک کے وزراء بھی ہیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟ تم کچھ کر سکتے ہو؟''وہ بڑے حظ اٹھاتے انداز سے کہہ رہا تھا۔اور نوید نفرت سے اُسکی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''اس نے صرف جرائم کا اعتراف کیا ہے۔اِسکا دھندہ کہاں کہاں چل رہا ہے، اور اِسکے ساتھ مزید کتنے لوگ شامل ہیں، اُسکے بارے میں اِس نے کچھ نہیں بتایا۔''شیراز نے کہا۔ایسے اعتراف کا کوئی فائدہ نہ تھا، عدالت میں اُس نے مکر ہی جانا تھا۔

''تم یہاں سے اب کبھی نہیں جا سکتے۔''نوید نے اُسے کہا۔

''بھول ہے تمہاری!''وہ پھر ہنسا۔''ایئرپورٹ پر میری گرفتاری کی ویڈیو وائرل کرنے والے میرے ہی لوگ تھے۔اب تک میڈیا، ایک باعزت اور شریف شہری کو بنا کسی وجہ کے گرفتار کرنے پر واویلا کھڑا کر چکا ہو گا۔سی ٹی ڈی کو فوری طور پر میڈیا پر بیان دینا ہو گا۔تم

میرے بارے میں، میرے جرائم کے بارے میں سب کو بتاؤ گے۔ میڈیا کی خبریں ایوانوں میں بیٹھے ملکی اور غیر ملکی سیاست دانوں تک پہنچے گی۔ تو کیا تمہیں لگتا ہے کہ تم اُسکے بعد بھی میرا کچھ بگاڑ سکو گے؟ ایک چھوٹا سا ایف آئی اے آفیسر بھلا کیا ہی کر سکتا ہے؟ تم سب کو اپنی جانوں کی فکر کرنی چاہیے۔''اُسکو ذرا فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اُسکے انداز میں ایک چیلنج تھا کہ لو کر لو جو کر سکتے ہو۔

''تمہارا سامنا اُن لوگوں سے ہے، جنہیں موت اتنی ہی عزیز ہے، جتنی تمہیں زندگی! (~خالد بن ولیدؓ)۔ ہم موت سے نہیں ڈرتے، فکر تمہیں کرنی چاہیے۔''نوید نے سر سراتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ اُسی لمحے اُسکی جیب میں رکھا موبائل بجا تو وہ پیچھے ہٹا۔

''اس سے سب اُگلواؤ!''شیراز کو حکم دیتا وہ باہر آیا اور موبائل دیکھا۔ رضا کی کال آرہی تھی۔ اُس نے تیز ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ فون اٹھایا۔

''کیا ہوا رضا؟ سب ٹھیک ہے؟ حسین کیسا ہے؟ اور عمر؟''اُس نے رضا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی پوچھا تھا۔

''وہ دونوں ابھی تک آپریشن تھیٹر میں ہی ہیں۔ لیکن فلحال ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیا؟''

''حور عین کو پتہ چل گیا ہے۔ وہ ہسپتال آرہی ہے۔''اُس نے بتایا۔

''میڈیا!''اُس نے لب بھینچے کہا۔ ''ٹھیک ہے! اُسے آنے دو۔ میں بھی کچھ دیر میں آرہا ہوں۔''اُس نے کہا پھر فون جیب میں رکھا، اور پیچھے مڑا۔ وحید اور ساگر آپس میں اُلجھے، اسی جانب آتے دکھائی دے رہے تھے۔

''اُسے گرفتار کرتے مجھے ہر گز نہیں معلوم تھا کہ کوئی ویڈیو بنا رہا ہے۔ یہ میری غلطی ہے، اگر میں احتیاط برتتا تو ہم خاموشی سے اُسے گرفتار کر کے، اُس سے سب اگلوا سکتے تھے۔ پر اب میڈیا پر سب آجانے کے بعد، ہم پر بہت بڑا پریشر آنے والا ہے۔ ہمیں اظہر کے بارے میں بتانا پڑے گا، نہ بھی بتایا تب بھی اوپر سے ٹھیک ٹھاک پریشر آئے گا۔''اُسکے قریب آکر رکتا ساگر پریشانی سے بول رہا تھا۔

''اوپر والے اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور ہم اپنے، ہم نے اپنے عہدے کے ساتھ کوئی بے ایمانی نہیں کی ہے۔ ہم اُسے گرفتار کر کے لائے ہیں اور اُسے ہر گز نہیں چھوڑیں گے۔ ہم پر اوپر والے پریشر ڈالیں گے بھی نہیں، کیونکہ جب تم میڈیا کو اظہر کے بارے میں بتاؤ

گے ،اگر اُسکے بعد اُسے چھوڑ دیا تو عوام ہی حکومت کے خلاف ہو جائیگی۔ وہ ہر صورت میں ججز کو نشانہ بنائیں گے۔اُن پر پریشر ڈالا جائیگا کہ وہ اظہر کو باعزت بری کریں۔ یہ کھیل بہت لمبا چلنے والا ہے۔ تم سب نے ثابت قدم رہنا ہے۔'' وحید نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''تم پریشان نہ ہو۔ تم نے جو کیا، وہ صحیح تھا۔'' نوید نے بھی ساگر کو تسلی دی تھی، پھر وحید کو دیکھا۔

''میں ہسپتال جا رہا ہوں۔'' اسے کہتا وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا، جہاں سے اُسے ولید کو ساتھ لینا تھا۔

--------+---------+----------

''حسین کہاں ہے؟'' حور عین اُسکے سامنے کھڑی تھی۔ زرد رنگ کے کپڑوں میں اُسکا چہرہ بھی زرد تھا، آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اُسکی گود میں اُسکی بیٹی تھی، پیچھے حسین کا بڑا بھائی کھڑا تھا۔ رضا نے پاس کھڑے علی کو دیکھا، پھر چہرہ جھکا دیا۔

''آپریشن ہو رہا ہے۔'' قریب موجود مقدّم نے آہستگی سے کہا۔

''ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟'' حسین کے بھائی نے پوچھا تھا۔

''فلحال دعا کرنے کہا ہے۔'' علی نے نپا تلا سا جواب دیا۔ حور عین کے لب کپکپائے، آنکھوں میں آنسو نمودار ہوئے تو وہ پاس رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ گود میں سوئی بیٹی کو خود میں بھینچا، جیسے اپنے خوف کو کم کرنا چاہ رہی ہو۔ رضا کو دکھ ہوا۔

''وہ ٹھیک ہو جائیگا نا؟'' چہرہ اٹھا کر اُس نے پوچھا بھی رضا سے ہی تھا۔

''ان شاءاللہ!'' وہ آہستہ سے کہتا علی کے برابر جا کھڑا ہوا۔ یا شاید اُسکے پیچھے خود کو چھپانا چاہا۔

اسی لمحے دو دروازے ایک ساتھ کھلے تھے۔ ایک راہداری کا دروازہ تھا، اور ایک آپریشن تھیٹر کا۔ راہداری سے داخل ہونے والے پر کسی کی توجہ نہیں گئی تھی، کیونکہ وہ آپریشن تھیٹر سے نکلنے والی پانچ ڈاکٹروں پر مشتمل ٹیم کو دیکھ رہے تھے۔ کیا آپریشن مکمل ہو گیا تھا؟ تو پھر لال بتی ابھی تک روشن کیوں تھی؟ ڈاکٹر اُنکے پاس آکر رک گئے تھے۔

''حسین کیسا ہے؟'' پہلا سوال حور عین نے کیا تھا۔

''آپ کون؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔ یہ سب میں نیا چہرہ نظر آیا تھا۔

''اُسکی بیوی ہے یہ اور میں اُسکا بھائی ہوں۔ وہ ٹھیک ہے نا؟'' اُسکے بھائی نے پوچھا تو ڈاکٹر نے گہری سانس لیکر ماسک نیچے کیا۔

''جان کو اب خطرہ نہیں ہے۔'' پہلا حوصلہ افزا جملہ، اُنہوں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

''گو کہ جگر کے پاس زخم آنے کی وجہ سے اندرونی خون بہنے لگا تھا، لیکن بروقت طبّی امداد ملنے اور خون مل جانے کی وجہ سے خون نہ صرف روک لیا گیا، بلکہ جگر بھی محفوظ رہا۔ جلد زخم بھی مندمل ہو جائیں گے۔ ہم اُنہیں وارڈ میں شفٹ کر رہے ہیں۔ ابھی ہفتے بھر اُنکا Dialysis ہو گا۔ پھر آپ اُنہیں۔۔۔''

''ڈائیلاسز؟'' بہت سے لوگوں کے منہ سے بیک وقت نکلا تھا۔ یہ ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا؟

''ڈائیلاسز کیوں؟ اُسکا گردہ تو ٹھیک ہے۔'' حورعین نے کہا۔

''جی جی! گردہ ٹھیک ہے۔ لیکن بعض دفعہ کسی گہرے جھٹکے، یا دباؤ کے باعث عارضی طور پر گردہ کام کرنا بند کر دیتا ہے۔ اِنکے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے، جبکہ انکے پاس ایک ہی گردہ ہے، تو دباؤ بھی شدید تھا۔ فلحال ڈائیلاسز ہو گا، ان شاءاللہ زخم مندمل ہوتے ہی گردہ کام شروع کر سکتا ہے۔'' دوسرے ڈاکٹر نے کہا تھا۔ وہ اُمید دلا رہا تھا یا واپس لے رہا تھا؟ وہ کیا کر رہا تھا؟ حورعین اُسکے بھائی کا بازو پکڑ کر دوبارہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

''اور عمر؟'' اِس سوال پر سب نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ نوید تھا، ولید اُسکی گود میں موجود تھا، وہ وہاں کب آیا؟ شاید راہداری سے داخل ہونے والا وہی تھا۔

''وہ ٹھیک نہیں ہیں۔'' اب کہ ڈاکٹر کی آواز آہستہ ہوئی۔ دلوں میں کوئی ضرب پڑی تھی۔ یہ اتنے حوصلہ شکن جملے کیوں بول رہا تھا؟ کیوں؟

''پانچ گولیاں لگنا اپنے آپ میں ہی بہت بڑا خطرہ ہے۔ پھیپھڑے زخمی ہیں۔ ہم نے دل کے گرد جمع ہونے والا خون صاف کر دیا ہے اور دل پر پڑنے والا دباؤ ختم کر دیا ہے۔ لیکن دل کو شدید صدمہ پہنچا ہے۔ اگلے چوبیس گھنٹے انتہائی اہم ہیں۔ اس دوران دل کی دھڑکنیں بے ترتیب رہ سکتی ہیں اور سانس لینے میں بھی دشواری رہے گی۔ اگر اگلے چوبیس گھنٹے دل نے مستحکم رہ کر گزار لیے تو خطرہ کافی حد تک ٹل

جائے گا۔اِس کے بعد دوائیں بھی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیں گی، سوزش کم ہو جائیگی، زخم بھرنے لگ جائیں گے، اور دل کی دھڑکن اور سانسیں بھی آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگیں گی۔ لیکن فلحال اُنکی حالت کے پیشِ نظر اُنہیں انتہائی نگہداشت یونٹ میں منتقل کر رہے ہیں۔" آج کے دن کی بدترین خبر!

"وہ ٹھیک ہو جائیگا نا؟" پھر وہی سوال۔ مقدّم کے لہجے میں اُمیدیں ٹوٹ رہی تھیں۔

"اگر چوبیس گھنٹے نکال لیے تو ہاں!" راہداری میں سنّاٹا چھا گیا۔

"ہم مل سکتے ہیں اُنہیں؟" رضا نے پوچھا۔

"حسین سے مل سکتے ہیں۔ اُنہیں وارڈ میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ البتہ عمر صاحب سے ملنے کے لیے ایک وقت میں ایک شخص ہی جا سکتا ہے۔" اُنہوں نے کہا۔ پھر مزید ہدایات دینے کے بعد چلے گئے۔ حور عین پھر سے رو رہی تھی، اُسکی سسکیاں سارے میں گونج رہی تھیں۔ حسین کا بھائی سر تھامے وہیں بیٹھ گیا تھا۔

"رضا! کیا تم اسے دیکھ لو گے؟" نوید نے رضا کے قریب آتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا تو نوید نے ولید کو اُسکے ساتھ والی کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ اب تک گھر نہیں جا سکا تھا۔

"علی!" پھر اُس نے علی کو مخاطب کیا۔

"ہونہہ؟"

"عمر کے والدین کو اطلاع دے دو۔" اِس بات پر تینوں نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

"پر۔۔۔" علی نے کچھ کہنا چاہا۔

"یہ ضروری ہے۔" نوید نے اُسکی بات کاٹ دی۔ "وہ اُسکے ماں باپ ہیں۔ اُنہیں اپنے بیٹے سے ملنے کا پورا حق ہے۔" اُس نے سنجیدگی سے کہا تو علی نے سر ہلایا اور کانپتے ہاتھوں سے عمر کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔ پتہ نہیں وہ کیسے کرے گا یہ؟ پر اُسے یہ کرنا تھا۔ اگر خدانخواستہ عمر کو کچھ ہو گیا تو اُسکے ماں باپ یہ غم تاعمر سہہ نہیں پائیں گے۔

''میں آتا ہوں۔''نوید آہستگی سے کہتے وہاں سے باہر نکلا۔اُسکے پیچھے جاتی آنکھوں نے،اُسکی سرخ آنکھوں کو دیکھ لیا تھا۔وہ جذبات چھپانے میں ناکام ہو رہا تھا تو اُسکے لیے فرار بہتر تھا۔

''یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔یہ بالکل نہیں ہونا چاہیے تھا۔''راہداری سے باہر نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا نوید اپنی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو بار بار صاف کر رہا تھا۔اُسے کوئی کونا ڈھونڈنا تھا۔اُسے رونا تھا۔

پیچھے راہداری میں حور عین کی سسکیاں اب تک گونج رہی تھیں۔

--------+---------+----------

راہداری میں دو نفوس موجود تھے۔ایک حور اور دوسرا نوید۔

رضا، حسین سے ملنے وارڈ گیا تھا،اور علی اور مقدّم، عمر کو دیکھنے آئی سی یو۔۔۔

حور عین نہیں گئی،وہ وارڈ کے باہر سے حسین کو دیکھ کر روتی ہوئی واپس آ گئی تھی۔اُسکی ہمت نہیں تھی۔ایک ہنستے کھیلتے، چلبلے انسان کو ایسے دیکھنے کی ہمت اُس میں بالکل نہیں تھی۔

''حسین نے مجھ سے کہا تھا کہ اللہ کے بعد اُسے ایف آئی اے پر بھروسہ ہے،وہ مجھے کچھ نہیں ہونے دے گی۔''خالی راہداری میں حور عین کی آواز گونجی تو نوید نے اُسے دیکھا۔

''میں نے کہا یہ اندھا بھروسہ ہے حسین!''اب کہ اُس نے نم آنکھیں اُٹھا کر نوید کو دیکھا۔اور نوید شرمسار۔۔۔

''اُس نے کہا مجھے میرے دوست پر بھروسہ ہے۔وہی دوست جس نے اُسے اپنے دروازے سے لوٹایا تھا۔''اُسکے لہجے میں طنز نہیں تھا،پر دکھ تھے۔

''میں اُسے وضاحت دے چکا ہوں۔''اُس نے آہستگی سے کہا۔

''پر تم نے اُسے بچایا بھی نہیں!''اس بات پر نوید کا سر جھکا، پھر اُس نے چہرہ اٹھایا تو آنکھیں سرخ تھیں۔

''اُسے ایمان نے گولی ماری ہے۔''اُس نے بتانا مناسب سمجھا۔

''ایمان؟''اُسے نہیں معلوم تھا شاید!

''ہاں! حسین کی کزن ایمان۔۔۔''پھر وہ اُسے سب بتانے لگا اور وہ حیرت زدہ سی سننے لگی۔

''تم جاؤ مقدّم!''دوسری جانب آئی سی یو کے باہر رک کر علی نے مقدم سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے اندر چلا گیا۔جبکہ علی گہری گہری سانس لیکر خود کو پرسکون کرنے لگا۔اُس نے ابھی ہی عمر کے باپ کو اطلاع دی تھی۔

آئی سی یو کے دروازے کے اُس پار وقت جیسے رک گیا تھا۔

سفید روشنی میں نہایا ہوا کمرہ بے حد خاموش تھا، مگر اُس خاموشی کے بیچ، وقفے وقفے سے گونجتی مشینوں کی بیپ دل پر ہتھوڑے کی طرح پڑ رہی تھی۔ بستر پر لیٹا وجود ہوش حواس سے بیگانہ تھا۔زندہ ہوتے ہوئے بھی زندوں جیسا نہ تھا۔اُسے دیکھ کے مقدّم کے دل پر جیسے ہتھوڑا پڑا تھا۔

اُسکا پورا سینہ موٹی سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔کندھوں سے بازوؤں تک جا بجا پٹیوں پر نیل اور خون کے داغ پڑ چکے تھے۔ہاتھ کی رگوں میں کئی کینولا پیوست تھے، جن سے شفاف دوائیں قطرہ قطرہ اُس کے جسم میں اتر رہی تھیں، وہ اب اپنی بقا کی جنگ خود نہیں لڑ پا رہا تھا۔ ناک اور منہ پر آکسیجن کا ماسک چڑھا تھا۔ہر سانس جیسے کسی دشواری کے ساتھ لے رہا تھا۔

دل کی دھڑکن مانیٹر پر سبز لکیر کی صورت دوڑ رہی تھی۔ کبھی باقاعدہ، کبھی بے ترتیب۔۔۔اور ہر بے ترتیبی پر مشین ایک تیز آواز کے ساتھ کمرے کی خاموشی چیر دیتی تھی۔ چہرے پر زندگی کا رنگ باقی نہ تھا۔وہی چہرہ جو ہمیشہ اعتماد، حوصلے اور مسکراہٹ کی علامت تھا، اب زرد پڑا ہوا تھا۔خشک ہونٹ، بند پلکیں اور جسم پر پٹیاں۔۔۔ وہ مہربان دوست جو دوسروں کے لیے ڈھال بن کر کھڑا رہتا تھا، آج خود بے بس پڑا تھا۔اتنا بے بس کہ پلک جھپکانے کا اختیار بھی اُس کے پاس نہ تھا۔

مقدّم اُسکے قریب آیا۔اُسکی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔آنسو اُسکی آنکھوں سے چھلک کے نکل پڑے۔

''میں نے لیلیٰ کو کھو دیا ہے عمر! تم مت جانا مجھے چھوڑ کر۔۔۔خدا کے لیے یار!''اُس نے جیسے التجا کی تھی۔اُسکے پاس ہمت اِس سے زیادہ نہ تھی، اِس لیے اُسکا سر سہلاتے واپس باہر چلا گیا۔وہ گیا تو علی اندر آیا۔پہلی نظر اُسے دیکھتے ہی اُس نے آنکھیں میچیں۔اِس طرح اُسے دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔پھر آنکھیں کھولیں تو نگاہیں دھندلا گئیں۔آنسو باڑ توڑ کر باہر آنے لگے۔وہ آہستہ آہستہ چلتا اُسکے پاس آیا۔

اُسے اپنے سامنے بے حس و حرکت پڑا دیکھ کے دل میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ دو سال سے عمر کے ساتھ تھا، دو سال میں ایک بار بھی اُس نے علی کو اپنی پریشانی نہیں بتائی۔ وہ اُسے ایک منافق و خود غرض دوست سمجھتا رہا جبکہ خود غرض تو وہ خود تھا۔ کتنا برا دوست تھا وہ؟

علی نے اُسکے پٹیوں سے جکڑے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ اُسکے وجود میں جنبش بھی نہ ہوئی۔ وہ اُنکا سب سے حساس دوست تھا۔ ہر وقت دستیاب رہنے والا، دوسروں کے لیے جان تک دے دینے والا۔ اور آج اُسکی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اُس روز بھی نہ تھا جب وہ بیرونِ ملک میں اکیلے زندگی کی جنگ لڑ رہا تھا۔

''میں نے تمہارے ابّو سے وعدہ کیا تھا۔'' وہ بولا تو آواز بھرا گئی۔ ''وعدہ کیا تھا کہ اپنے بھائی کو صحیح سلامت واپس لاؤں گا۔ مجھے وعدہ خلاف نہ بناؤ عمر! میں تمہارے ابّو کو کیا جواب دوں گا؟'' اُس نے آہستہ سے کہا۔ ایک آنسو آنکھوں سے بہہ کر اُسکے ماسک میں جذب ہو گیا۔

کتنا عجیب ہوتا ہے نا!

کبھی ایک انسان پورے ہجوم کا سہارا ہوتا ہے، اور کبھی وہی انسان خاموش پڑا ہوتا ہے، جبکہ پورا ہجوم بے بس ہو کر صرف اُس کے ایک بار آنکھیں کھولنے کی دعا مانگ رہا ہوتا ہے۔

دوسری طرف وارڈ میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ وہ خاموشی، جسے اگر کسی نے سب سے زیادہ ناپسند کیا ہوتا، تو وہ خود حسین ہوتا۔ بستر پر لیٹا ہوا شخص اِس وقت پہچان میں نہیں آ رہا تھا۔

جس کے قہقہوں سے کمرے گونج اٹھتے تھے، آج اُس کے ہونٹوں پر ایک جنبش تک نہ تھی۔ چہرہ زرد اور سوجا ہوا تھا۔ پلکیں بند تھیں، ناک پر آکسیجن کی نلکیاں تھیں، بازوؤں میں ڈرپس لگی تھیں، اور سینے کے نیچے سے نکلتی ڈرین کی باریک نالیاں خاموشی سے خون اور رطوبت اپنے اندر سمیٹ رہی تھیں۔ پیٹ اور پہلو پر بندھی موٹی پٹیاں اُن گولیوں کی گواہی دے رہی تھیں، جنہوں نے اُس کے جسم کو چھلنی کر دیا تھا۔ ایک گردہ تو وہ پہلے ہی کھو چکا تھا۔ اور اب قسمت نے باقی ماندہ واحد سہارے پر بھی وار کیا تھا۔

مانیٹر پر چلتی سبز لکیر بتا رہی تھی کہ وہ ابھی زندہ ہے۔

مگر حسین کی زندگی کی اصل پہچان تو اُس کی آواز تھی۔

وہ آواز۔۔۔۔۔

جو ہر مشکل لمحے میں کوئی نہ کوئی فضول سا لطیفہ سنا کر سب کو ہنسا دیتی تھی۔۔۔۔

وہ آواز۔۔۔۔

جو ہر اداس چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لے آتی تھی۔

آج پورا کمرہ اُس آواز کا منتظر تھا۔۔۔

کمرے میں بہت دیر سے خاموش کھڑا رضا بھی۔۔۔۔

اُسکے پیچھے بعد میں داخل ہونے والے علی اور مقدّم بھی۔۔۔

اور دروازے پر رک کر کھڑا نوید بھی۔۔۔

مگر وہاں صرف مشینوں کی مسلسل آواز سنائی دے رہی تھی۔

کتنی عجیب بات ہے نا!

بعض لوگ جب خاموش ہوتے ہیں تو صرف خاموش نہیں ہوتے۔۔۔۔

وہ اپنے ساتھ پوری کائنات خاموش کر دیتے ہیں۔

اور حسین۔۔۔آج پہلی بار اتنا خاموش تھا کہ اُس کی خاموشی، اُس کے ہزاروں قہقہوں سے زیادہ گونج رہی تھیں۔

زندگی اُسکی آنکھوں میں جیتی تھی، اور وہ آنکھیں آج بند تھیں۔۔۔

اُسکا جسم سوجا ہوا تھا۔ رضا کب سے کھڑا اُسے یونہی یک ٹک دیکھ رہا تھا۔

''کیا اس نے آنکھیں کھولیں؟'' مقدّم نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو اُس نے پلٹ کر دیکھا۔

''ایک بار کھولی تھی، کچھ دیر کے لیے۔ پھر بند کرلیں۔''اُس نے بتایا۔ بات کرتے یونہی، ایک نظر نوید کو دیکھ لیا۔ وہ اب تک دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ بڑا کمزور دل واقع ہوا تھا۔ ہاں! وہ واقعی کمزور دل تھا۔

اُسی لمحے حسین کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔ تینوں بیک وقت اُسکے قریب ہوئے۔ نوید بیساختہ وارڈ کے اندر آگیا۔ اُس نے آہستگی سے آنکھیں کھولی۔

''حسین!۔۔۔تم ٹھیک ہو؟''رضا نے اُسکا ہاتھ تھامتے بے قراری سے پوچھا۔

وہ چند لمحے سب کو دیکھتا رہا۔ چہرہ سوجا ہونے کی وجہ سے آنکھیں بھی چھوٹی لگ رہی تھیں۔ پھر اُسکے لب ہلے۔

''ہاں! بولو!''مقدّم نے پوچھا تھا۔ جیسے اُسے بولنے کے لیے ہمت دی ہو۔

''عم۔۔۔عمر۔۔۔''سب نے بیساختہ ایک دوسرے کو دیکھا۔ اُسے اِس حالت میں بھی عمر کی فکر ہوئی تھی۔

''وہ ٹھیک ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔''پہلی بار نوید نے جواب دیا تھا۔ اُس نے بس سر ہلا دیا۔

''تم نے تو ڈرا دیا تھا حسین!''رضا نے کہا تھا۔ پر وہ اُسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ سیدھی کروٹ پر ڈھلکے چہرے پر سجی آنکھیں، دروازے کی جانب تھیں۔

''تم ٹھیک ہونا! کہیں درد تو نہیں ہورہا ہے؟''علی نے پریشانی سے پوچھا تھا۔ وہ اب بھی چپ چاپ یک ٹک دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ اُسکی نظروں کے تعاقب میں سب نے بے ساختہ دروازے کی جانب دیکھا تو وہاں حورعین کو کھڑا پایا۔ دروازے کے قبضے پر چہرہ ٹکائے، وہ ایسے کھڑی تھی جیسے کوئی بچہ شکایت ملنے پر پرنسپل کے کمرے کے باہر کھڑا ہوتا ہے۔ ڈری، سہمی اور خوفزدہ سی۔۔۔

وہ حسین کو دیکھ رہی تھی۔۔۔۔

اور حسین اُسے۔۔۔۔

**~دل نہ اُمید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے**

**لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے**

حسین لحظے بھر کو مسکرایا۔ پھر اُسکی آنکھیں دوبارہ بند ہو گئی۔

وہ خاموشی سے دونوں کو چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے۔

باہر آئے تو عمر کے والدین آ چکے تھے۔ اُسکی امی دل تھامے، بلک بلک کر روتی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ علی کو دیکھ کر حفیظ صاحب فوراً اُسکے پاس آئے تھے۔ اُس نے سر جھکا دیا۔

''تم نے کہا تھا۔۔۔ تم نے کہا تھا کہ عمر کو کچھ نہیں ہو گا۔ بتاؤ مجھے کہاں ہے میرا بیٹا؟'' وہ اُس پر چیخے تھے۔ علی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''تم نے جھوٹ بولا۔ میرے منہ پر مجھ سے جھوٹ بولا۔'' وہ رو رہے تھے اور علی بے بس سا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

''انکل! آپ اِدھر بیٹھے۔'' نوید نے انھیں کندھوں سے تھام کر بٹھایا تھا۔ اب وہ اُنہیں کچھ سمجھا رہا تھا۔

''تمہارا قصور نہیں ہے۔'' مقدّم نے چپ چاپ پشیمان کھڑے علی کے کندھے کے گرد بازو پھیلاتے اُسے تسلی دی تھی۔

پر اب کوئی تسلی کام نہیں آنے والی تھی۔

--------+---------+----------

مشاورتی کمرے میں اِس وقت چار نفوس موجود تھے۔ وحید جا چکا تھا، اُسکی ڈیوٹی تھی۔

ساگر، شیراز اور فیصل، ڈی آئی جی فرّخ کے سامنے موجود تھے۔ اظہر سے تفتیش ابھی باقی تھی، اُس نے صرف جرائم کا اعتراف کیا تھا۔ کوئی قابلِ ذکر معلومات اب تک فراہم نہ کی تھیں۔

''جیسا اظہر نے کہا تھا، بالکل ویسا ہی ہو رہا ہے۔ یہ کیس حکومتی سطح پر پہنچ چکا ہے اور کچھ ہی دنوں میں یہ ہائی پروفائل کیس بن جائیگا ہے۔ اور اِس میں بہت بڑے بڑے نام بھی شامل ہوں گے۔'' ساگر نے کہا۔

''وہ تمام باتیں تو ٹھیک ہیں، لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ اُس نے اپنے آخری جرم کا اعتراف کیوں نہیں کیا؟'' فیصل نے پوچھا۔

''آخری جرم؟'' شیراز نے ناسمجھی سے دیکھا۔

''نوید سر اور اُنکے دوستوں کا کیس!''اُس نے یاد دلایا۔

''اوہ اچھا!''اُس نے سمجھ کر سر ہلایا۔

''وہ کیا کہتا ہے؟''فرّخ صاحب نے پوچھا۔

''وہ کہتا ہے کہ وہ ان چھے لوگوں میں کسی ایک کو بھی نہیں جانتا اور نہ اُسکا اُن میں سے کسی سے کوئی تعلق ہے۔ حسین کو بھی وہ فقط رشتے دار کی حیثیت سے ہی جانتا ہے۔''ساگر نے کہا۔

''جب اُس نے اپنے تمام جرائم بڑی ڈھٹائی سے قبول کیے ہیں تو وہ اِس بات کو قبول کیوں نہیں کر رہا؟''فیصل نے سوال دہرایا۔

''یہی تو میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ وہ یہ بات ماننے سے انکاری ہے کہ اُس نے ان لوگوں کے قتل کا حکم مائیکل کو دیا ہو۔ بقول اُسکے وہ تو اُنکو جانتا تک نہیں ہے۔''ساگر نے پریشانی سے ماتھا مسلا۔

''کیا معلوم مائیکل نے خود سے اُن لوگوں کی تصاویر جمع کر رکھی ہوں؟ اظہر کا اُن سے تعلق نہ ہو؟''شیراز نے کہا۔

''ناممکن! اُسکے بقول مائیکل اُس سے پوچھے بنا کوئی کام نہیں کرتا تھا۔''

''وہ ہمارے ساتھ کوئی کھیل، کھیل رہا ہے۔''فیصل نے غصّے سے کہا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔''کمرے میں فرّخ صاحب کی مدھم آواز گونجی تو تینوں نے حیرت سے اُنہیں دیکھا۔

''کیا مطلب؟''

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اُسکا اُن چھے لوگوں سے نہ کوئی تعلق ہے اور نہ وہ تصاویر اُس نے ڈائری میں لگائی ہیں۔''اُنکا لہجہ پراسرار سا تھا۔

''تو پھر کس نے لگائی ہیں؟''

''کسی اور نے، جس تک ہم نہیں پہنچ سکے۔''انہوں نے جیسے تھک کر کرسی کی پشت پر سر ٹکایا۔

''آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''ساگر نے سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اظہر نے تمام جرائم قبول کیے، پھر وہ اِس ایک نہ ہونے والے قتل کو کیوں قبول نہیں کرے گا؟ وہ ڈھیٹ شخص بڑے مزے سے ہمیں اپنے تمام قتل کی داستان سنا رہا ہے تو وہ اِس بات پر انجان کیوں بنے گا؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''اگر بالفرض مان بھی لیں کہ وہی ان چھے لوگوں کے پیچھے تھا، تو پچھلے چھ ماہ سے ہم نے کسی کے بھی آس پاس کوئی مشکوک سرگرمی کیوں نہ دیکھی؟ مورخہ چھے کا جتنا خوف ہمارے دلوں میں تھا، اُس روز تو کچھ بھی نہ ہوا۔ فرح بھی فقط پُرانی دشمنی کی بنا پر اُس رات نوید کو قتل کرنے آئی تھی۔ اور جب نوید فرح کے قریبی آدمیوں میں شامل ہوا تھا تو فرح نوید کو کیوں پہچان نہ پائی، جبکہ اظہر تو نوید کو قتل کرنا چاہتا تھا، اور وہ اظہر کے تمام جرائم کو اچھے سے جانتی تھی۔ اُسے تو فوراً نوید کو پہچان لینا چاہیے تھا؟ اور اگر اظہر ان سب کو جانتا تو وہ اتنے سال انتظار کیوں کرتا؟ جب یہ سب الگ تھے تو انہیں زیادہ آسان تھا۔ اُس پر سے مزید برآں یہ کہ وہ نوید کے بیٹے کو رضا کے پاس کیوں رکھواتا؟ اگر وہ واقعی ان سب کا دشمن ہوتا تو وہ اپنے ایک دشمن کے بیٹے کو دوسری کے پاس کیوں رکھوائے گا؟'' اُنکے سوال پر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُنکے ہاتھ ایک ڈور آئی تھی۔ اُلجھی ہوئی ڈور!

''ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی کھیل کھیلنا چاہتا ہو؟ سائیکو تو ہے وہ!۔۔۔'' فیصل نے بھونڈی سی وضاحت پیش کی۔

''اتنا بیوقوفانہ کھیل؟'' انہوں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ سب سوچو تو بہت بیوقوفانہ لگتا ہے۔''

''یعنی؟'' ساگر نے پوچھا۔

''یعنی۔۔۔'' وہ آگے کو ہوئے۔ ''اس تمام کہانی میں جھول ہے۔'' انہوں نے آہستہ سے کہا تھا۔

----------+---------+--------

''اگر ایمان انکار نہ کرتی تو تمہیں دنیا کا سب سے بہترین مرد نہ ملتا۔ تمہیں تو اسکا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔'' کبھی کسی شام حسین نے اسے چھیڑا تھا۔ وہ شام یاد کر کے وہ ہسپتال کی راہداری میں بیٹھی اُداسی سے مسکرائی تھی۔

''ہاں! دنیا کا سب سے نکما انسان میرے سر جو تھوپ دیا گیا ہے، اِس بات کا شکریہ؟'' وہ جواباً تُرخ کر بولی تو وہ ہنس دیا تھا۔ اُسکے دونوں گالوں پر گہرے گڑھے پڑے تھے۔

"ناشکری ہی رہنا تم!" وہ مصنوعی ناراضگی سے بولا تھا۔

حسین کے وارڈ سے آوازیں آرہی تھیں، راؤنڈ پر موجود ڈاکٹر معمول کے چیک اپ کے لیے اندر تھے۔ اسی لمحے دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک نرس بھاگتی ہوئی سینئر ڈاکٹر کے کمرے کی جانب گئی تھی۔

حور عین کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"یا اللہ! کچھ نہیں۔۔۔ کوئی بری خبر نہیں۔۔۔ پلیز!۔۔۔" وہ دل پر ہاتھ رکھے آنکھیں بند کر کے دعا مانگ رہی تھی۔

موت کبھی انسان کے ہاتھ میں نہ تھی، نہ ہے اور نہ ہو گی۔

بچانے والے نے جب بچانا ہوتا ہے تو آگ بھی گلستان بن جاتی ہے، کنواں بھی زندہ رکھتا ہے، مچھلی کا پیٹ بھی عارضی قیام گاہ بن جاتا ہے، سمندر رشق ہو جاتا ہے، اور بندہ زندہ آسمان پر اٹھالیا جاتا ہے۔

پس اگر بچانے والا بچانا چاہے تو۔۔۔

راہداری میں بھاگ دوڑ مچ گئی تھی۔ حسین کے کمرے سے بھاگ کر، ہانپتے ہوئے باہر آتی نرس کے چہرے پر کچھ تھا۔ کچھ پر جوش سا، آنکھوں میں کوئی خوشی کا تاثر تھا۔ پر حور عین وہاں سے نہ ہلی۔ وہ ڈرپوک تھی، اپنے پیارے کے معاملے میں وہ ایسی ہی ڈرپوک واقع ہوئی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو سینے میں بھینچ لیا۔

نجانے کتنے لمحے سرکے؟

گھنٹے یا صدیاں؟

حسین کے بھائی بھی وہاں آگئے، اُسکے دوست بھی۔ پھر ڈاکٹر باہر آیا۔ ماتھے سے پسینہ ایسے صاف کیا جیسے کوئی محاذ سر کر کے آیا ہو۔ اُسے دیکھ کر سب اُسکی جانب بڑھے تھے۔ سوائے حور عین کے۔

"کیا ہوا تھا ڈاکٹر صاحب؟" حسین کا بھائی پریشان تھا۔

''معجزہ!''اُس نے یک لفظی جواب دیااور مسکرایا۔''حیران کن طور پراُنکے گردے نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔اور الحمداللہ! پہلے کی طرح فعال ہو گیا ہے۔اُنہیں اب ڈائلیسس کی ضرورت نہیں رہے گی۔''ڈاکٹر نے پہلی بار حوصلہ افزا بات کی تو ساتھ میں حوصلے توڑے نہیں تھے۔

''یقیناً آپ سب کی دعائیں تھی انکے ساتھ۔۔۔''ڈاکٹر جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا؟ پر حور کو اور کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔اُسے بس اتنا معلوم تھا کہ حسین اُسے چھوڑ کر نہیں گیا ہے۔کہیں نہیں!

--------+---------+----------

چوبیس گھنٹے۔۔۔

عمر حفیظ نے چوبیس گھنٹے نکال لیے تھے۔اُسکا دل نارمل رفتار سے دھڑکنے لگا تھا۔رات اُس نے آنکھیں بھی کھولی تھیں۔کچھ دیر اپنی روتی ماں کو دیکھتا رہا تھا۔پھر دوبارہ غنودگی میں چلا گیا تھا۔

صبح تک اُسکی حالت قدرے بہتر ہو گئی تو ڈاکٹر نے اُسے وارڈ میں منتقل کر دیا۔

''دوراتوں سے میں مسلسل جاگ رہا ہوں۔تم دونوں نے ایسی زمین کھینچی ہے قدموں سے کہ کھڑے رہنا مشکل ہو گیا تھا۔''جب وہ وارڈ منتقل ہوا تو صبح سب اُس سے ملنے آئے تھے۔تب ہی مقدّم نے اُس سے شکوہ کیا تو وہ مسکرایا۔چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے،پر اب وہ خطرے سے باہر تھا۔آکسیجن ماسک اب بھی لگا تھا کہ پھیپھڑوں کے زخم مندمل ہونے میں وقت درکار تھا۔

''حسین کیسا ہے؟''اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے وہ بھی،تم فکر نہ کرو۔''مقدّم نے جواب دیا۔

''تمہیں کہیں درد تو نہیں ہو رہا؟''پھر فکر مندی سے پوچھا تو اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم پیچھے بھی ہٹ جاؤ یہاں سے۔۔۔''اُسی لمحے رضا نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر زبردستی پیچھے ہٹایا تو عمر کے چہرے پر بیساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''تو میں بات بھی نہ کروں اُس سے؟''اُس نے منہ بنایا۔

''کر تو لی اتنی باتیں، اب پیچھے کھڑے رہو سکون سے۔''رضا کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا۔

''تم ٹھیک ہو نا عمر؟''پھر اُس نے عمر کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اُس نے ابھی ابھی میری اِسی بات کا جواب دیا تھا۔''مقدّم نے جتایا۔

''میں ٹھیک ہوں اب!''عمر مزید بحث نہیں چاہتا تھا، لہٰذا فوراً جواب دیا۔

''نوید کہاں ہے؟''اُسکی متلاشی نظروں نے نوید کو ڈھونڈا۔

''باہر ہی ہے، ڈاکٹر سے بات کر رہا ہے۔ تمہارے ابّو مجھ سے ناراض ہیں۔''جواب علی نے دیا۔

''وہ یقیناً مجھ سے بھی ہوں گے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ عمر کے والدین بھی وہیں آ گئے۔ امی تو اُسکی بلائیں لیتے نہ تھک رہی تھیں، جبکہ ابّو ناراض سے، دور دور سے ہی اُسے دیکھ رہے تھے۔

وارڈ پار کر کے دوسرے وارڈ کی طرف نظریں گھمائی جائیں، تو ایس ایس پی نوید عالم نے ابھی ابھی، عمر سے مل کر آنے والے رضا کے حوالے ولید کو کیا ہے، اور اب وہ حسین کے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ولید بھی رضا کے ساتھ بیٹھا بڑے مزے سے رول کھا رہا تھا، جو اُس نے اپنے باپ سے فرمائش کر کے مانگا تھا۔ تین روز میں وہ نوید سے اچھا خاصا مانوس ہو چکا تھا۔

وہ حسین کے کمرے میں آیا تو وہ جاگ رہا تھا۔ بستر اوپر کی جانب ہو رکھا تھا، پر وہ ٹیک لگائے سامنے بے آواز چلتے نیوز چینل کو دیکھ رہا تھا۔ نوید کو اندر آتے دیکھا تو نظریں اُسی کی جانب گئی۔

''تم ٹھیک ہو؟''نوید نے اُسکے قریب آ کر سوال کیا۔

''تم گھر نہیں گئے؟''نوید عالم کی عادت حسین کے اندر منتقل ہو رہی تھی شاید!

''آج چلا جاؤں گا۔ تم کیسے ہو؟''اُس نے سوال دہرایا۔

''ایمان کا کیا ہوا؟'' آج وہ اُس کو بھی مات دے رہا تھا۔ نوید نے گہری سانس بھر کر اُسے دیکھا۔

''زیرِ حراست ہے۔ یہ سچ ہے کہ اُسے اپنے شوہر کے کالے کاموں کا کچھ علم نہ تھا۔ البتہ وہ گرفتار اپنے جرم کی بنا پر ہوئی ہے۔''

''میں اُسکے خلاف کوئی بیان نہیں دینا چاہتا۔'' حسین نے آہستگی سے کہا۔

''تم بیان دو یا نہ دو، لیکن اُس نے قانون ہاتھوں میں لیا ہے۔ سزا تو ہو گی ہی اُسے۔ اور ابھی عمر کا بیان بھی باقی ہے۔'' یکدم ہی حسین کو احساس ہوا کہ وہ صرف حسین کی مجرم نہیں تھی۔ وہ عمر کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے تھک کر سر پیچھے گرا لیا۔

''پریشان نہ ہو، تمہارے ماموں کی فیملی ابھی کچھ دیر قبل ہی اُسکی ضمانت کے لیے آئی ہے، اُمید ہے وہ گھر چلی جائے۔ البتہ مقدمہ تو اُس پر چلے گا۔'' نوید نے اُسے تسلی دی۔

''ہمم!'' اُس نے فقط اتنا ہی کہا۔

''مجھے تمہاری حفاظت کرنی تھی، پر نہیں کر سکا۔'' حسین نے بغور اُسے دیکھا، سروائیول گلٹ، ہوں ہہ!

''تمہیں افسوس تو ہو گا؟'' حسین نے کہا تو نوید نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''کس بات کا؟''

''یہی کہ میں نے تمہاری جگہ لے لی۔'' بڑی ہی بے موقع اور غیر متوقع جگت ماری تھی اُس نے۔

''میں چوبیس گھنٹے ہسپتال میں نہیں پڑا رہتا۔'' وہ برا مان گیا۔

''ہاں! ہر سال کے بارہ مہینوں میں سے چھ مہینے تو پڑے رہتے ہو۔'' اُس نے چڑایا۔

''میرے خیال سے تمہیں آرام کرنا چاہیے۔'' نوید نے جتایا۔

''اور میرے خیال سے تمہیں اب انسان بن جانا چاہیے۔'' اُس نے دوبدو کہا۔ نوید کے کچھ بھی کہنے سے قبل دروازہ کھلا اور حور عین اندر داخل ہوئی۔ روئی روئی سوجی سی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

''تم کیوں رو رہی ہو؟'' حسین نے ایسے پوچھا، جیسے معلوم ہی نہ ہو کہ کیوں رو رہی ہے؟

''تم زندہ جو بچ گئے۔'' اُس نے سوں سوں کرتے کہا تو نوید نے ذرا اچھنبے سے اُسے دیکھا۔

''کتنا افسوس ہو رہا ہو گا نا تمہیں، اچھا بھلا جان چھوٹ رہی تھی مجھ سے؟'' حسین نے پوچھا۔

''ہاں! اتنا اچھا موقع گنوا دیا۔'' اُس نے بھی باز نہیں آنا تھا۔

''نہیں حور عین بی بی! میں رنڈوا ہو جاؤں گا، پر تمہیں بیوہ نہیں ہونے دوں گا۔'' اُس نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو وہ ہنسی۔

''جب تم یہاں سے ڈسچارج ہو جاؤ تو۔۔۔'' کمرے میں نوید کی آواز گونجی تو دونوں نے رک کر اُسے دیکھا۔

''تو یہاں ایک نفسیات کے بہترین ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ اُن سے ضرور ملاقات کرنا۔۔۔ دونوں!'' وہ سنجیدہ تھا۔ بے حد سنجیدہ۔ دونوں ہنس دیئے۔ وہ سر جھٹکتے مسکرایا۔

''آرام کرو! میں چلتا ہوں اب۔'' وہ کہتے ہوئے باہر کی جانب بڑھ گیا۔ پیچھے حور عین کی پھر سے سسکنے کی آواز آئی تھی، یقیناً اندر کا غبار حسین کے سامنے ہی باہر آنا تھا۔

وہ باہر آیا تو پہلا سامنا رضا سے ہوا۔ مقدّم اور علی نہیں تھے۔

''باقی دونوں کہاں ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''دونوں گھر چلے گئے ہیں۔ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

''اچھا کیا اُنہوں نے۔ اب سب کو ہی گھر چلے جانا چاہیے۔'' اُس نے کہا۔

''ہاں! اور یقیناً تمہیں اور ولید کو بھی۔'' رضا نے مسکراتے ہوئے ولید کو اُسکے حوالے کیا۔

''اسے اب اِسکی ماں سے، اور اِسکے گھر والوں سے مزید دور نہیں رہنا چاہیے۔'' اُس نے نوید کو کہا۔

''تم کیسے رہو گے اِسکے بغیر؟'' نوید نے جانچتی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میں نے امانت سمجھ کر پالا ہے۔اور امانت لوٹانے کے لیے ہی ہوتی ہے۔''اُس نے کہا۔

''ساتھ ہی چلتے ہیں۔''نوید نے یکدم ہی کہا تو وہ رکا۔

''تمہارے گھر؟''وہ حیران ہوا۔

''نہیں! بشریٰ تو امی کی طرف ہے۔مجھے وہیں جانا ہے تو تمہیں بھی پناہ گاہ چھوڑ دوں گا۔تب تک تم ولید کے ساتھ کچھ وقت گزار لینا۔''
اُس نے کہا تو رضا مسکرایا۔وہ احساس سے عاری ہر گز نہ تھا۔

اب دونوں پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ایک کو اب ولید کے بغیر رہنا تھا۔

اور دوسرے کو اُسکے ساتھ۔۔۔

دونوں کے لیے یہ ایک نیا احساس تھا۔

--------+---------+----------

ماں کا دل۔۔۔

سمندر سے زیادہ گہرا۔۔۔

موم سے زیادہ نرم۔۔۔

چاند سے بھی زیادہ پیارا۔۔۔

ماں کا دل۔۔۔۔

تین روز سے بشریٰ سخت بے چین تھی۔دل کرتا تھا کہ قبرستان جائے پر نہ جاتی کہ نوید سے وعدہ کیا تھا۔دل تڑپ تڑپ جاتا۔بار بار لگتا جیسے اُسکے بیٹوں کی خوشبو آرہی ہے۔وہ ولید کے کپڑے نکال کر دیکھتی،اُسے سینے سے لگاتی،اُسکا فیڈر جو اُس نے آج تک سنبھال کر رکھا

تھا،اُسکے کھلونے۔۔۔ پتہ نہیں کیوں پر آج دل بہت تڑپ رہا تھا۔ جزااُسکی بے چینی صبح سے محسوس کر رہی تھی پر خاموش تھی۔ وحید بھی بیوی بچوں سمیت اُس سے ملنے آیا تھا،پر وہ بھی خاموش تھا۔ نوید نے اُن دونوں کو بشریٰ کو کچھ بھی بتانے سے منع کیا تھا۔ شام ہوتے تک جب اُسے لگا کہ دل کی بے چینی اب حد سے سوا ہو گئی ہے،اور شاید اُسکا دل اب برداشت نہیں کر پائے گا،تب ہی۔۔۔

تب ہی لاؤنج کا دروازہ کھلا،اور دراز قد نوید دروازے پر کھڑا نظر آیا۔ بشریٰ اُسے ایک ماہ بعد سامنے دیکھ کر بے چین ہو کر کھڑی ہوئی اور تب ہی اُسکی نظریں اُس بچے پر پڑیں۔ وہ جسکا پورا ہاتھ نوید کی ایک انگلی کو تھامے کھڑا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں چاکلیٹ پکڑے وہ اشتیاق سے گھر کو دیکھ رہا تھا۔

بشریٰ سن سی رہ گئی۔۔۔

ہوائیں۔۔۔سانسیں۔۔۔ساعتیں رک گئی۔۔۔

احساسات۔۔۔جذبات۔۔۔محسوسات۔۔۔سب منجمد ہو گئے۔۔۔

وہ ویسا ہی تھا۔اُسکی سوچوں جیسا۔۔اُسکے خواب جیسا۔۔۔

چہرہ معید جیسا اور آنکھیں بشریٰ جیسی۔۔۔۔

وہ آگے بڑھی۔ایک ایک قدم اٹھاتی۔۔۔اُس پر سے نگاہیں نہ ہٹاتی۔۔۔

آیا وہ نظریں پل بھر کو بھی ہٹائے تو وہ غائب ہو جائے۔۔۔

آیا وہ پلکیں جھپکائے اور اِس خواب سے آنکھیں کھل جائیں۔۔۔

وہ کب اُسکے پاس پہنچی معلوم نہیں؟ وہ نوید کو۔۔۔اُسکی موجودگی کو فراموش کر گئی اور نوید ساکت سا اُسے دیکھنے لگا۔اُسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔

بشریٰ گھٹنوں کے بل بیٹھی۔ ولید کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ وہ چہرہ جو اُس روز وہ تھام نہ سکی تھی۔ آج کوئی شیشے کی دیوار نہ تھی، یہ خواب بھی نہ تھا۔ ننھا ولید آنکھیں کھولے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''وا۔۔۔ولید۔۔۔''اُس نے پہچان لیا۔ماں کے دل نے اپنی اولاد کو لمحوں میں پہچان لیا۔نوید ساکت آنکھوں سے اُنہیں دیکھتا فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔اُسے اُمید نہ تھی،اُسکے تصور میں بھی نہ تھا۔کہ وہ اُسے یوں پہچان لے گی۔

''یس !آئی ایم ولید۔(ہاں !میں ولید ہوں۔)''اُس نے خوش ہو کر بتایا۔بشریٰ کو معلوم ہی نہ تھا،ساری عمر کے جمع آنسو آج ہی بھل بھل گالوں پر بہہ رہے تھے۔

''یہ۔۔۔یہ ولید ہے؟یہ میرا ولید ہے۔۔۔یہ ولید ہے نا؟میرا بیٹا ہے نا؟''وہ نوید سے پوچھ رہی تھی۔رو رہی تھی،تصدیق کر رہی تھی۔۔۔نوید کی زبان منجمد تھی،الفاظ حلق میں اٹک رہے تھے۔اُس نے آنسوؤں کا سمندر لیے آنکھوں سمیت،سر کو اثبات میں جنبش دی۔

''اوہ۔۔''بشریٰ کے گلے سے جیسے چیخ بر آمد ہوئی تھی۔''اوہ!یہ میرا بیٹا ہے۔''وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر چیخی تھی۔پتہ نہیں خوشی سے؟حیرانگی سے؟یا بے یقینی سے؟

''فرح نے اسکو مارا نہیں تھا۔وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔''جواب پیچھے کھڑے وحید نے دیا تھا۔دونوں نے ہی اُسے نہ دیکھا،نہ کچھ کہا۔

''میرا بچہ۔۔۔میرا بیٹا۔۔۔''بشریٰ نے تڑپ کر اُسے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

''ولید۔۔۔۔میرا بچہ۔۔۔ولید۔۔۔''وہ اسے چومتی جاتی اور تسبیح کے دانوں کی طرح اُسکے نام کا ورد کرتی جاتی۔اور نوید کے آنسو ٹپ ٹپ گرتے جاتے تھے،وہ بشریٰ کو روتے ہوئے نہیں برداشت کر سکتا تھا۔اُسکا دل اِس معاملے میں بڑا کمزور تھا۔

بشریٰ کو روتا دیکھ کر ولید نے بھی گھبرا کر رونا شروع کر دیا۔نوید نے ہاتھ بڑھا کر اُسے الگ کرنا چاہا پر وہ بھی بشریٰ سے الگ ہونے پر راضی نہ ہوا،ایسے اُسکے گلے سے چپک گیا جیسے صدیوں سے جانتا ہو۔ وہ دونوں اس اِس طرح رو رہے تھے کہ آس پاس کھڑے تمام لوگوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔نوید اِس سے زیادہ،اِس منظر کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔وہ اٹھا اور غیر محسوس انداز میں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف آیا۔

اندر آکر اس نے دروازہ بند کیا، چند قدم آگے آیا۔ گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھا اور پھر اپنا ماتھا فرش سے ٹکا دیا۔ آنسو اب فرش کو بھگونے لگے تھے۔

سجدہ شکر۔۔۔

شکر اس پر واجب تھا۔ وہ تاعمر بھی سر نہ اٹھاتا تو بھی کم تھا۔ وہ جانے کتنی دیر اس حالت میں رہا؟ اُسے یاد نہیں۔ پھر کمرے کا دروازہ کھلا، وہ تب بھی اسی حالت میں رہا۔ کسی نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُسکے وجود میں جنبش ہوئی۔ اُس نے سجدے سے سر اٹھا کر دیکھا تو بشریٰ سامنے تھی، اُسی کے ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھی۔ اُسکی گود میں، اُسکے دوپٹے کو ننھے ننھے ہاتھوں میں جکڑے ولید بھی تھا۔ نوید نے اُسکے کندھے کے گرد بازو پھیلا کر دونوں کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ بشریٰ نے آنسوؤں سے تر چہرہ اُسکے کندھے پر ٹکا دیا۔

بالآخر طویل مسافت تمام ہوئی تھی۔

----------+---------+--------

شام کے سات بج رہے تھے۔ موسم ابر آلود تھا، ہوا ٹھنڈی اور بارش کے قطروں سے گھلی ہوئی تھی۔ وہ پہلے گھر گیا، پھر تازہ دم ہو کر اب اُسکے دروازے پر تھا۔ اُس نے بیل پر ہاتھ رکھا اور اِس وقت تک رکھا، جب تک دروازہ کھل نہ گیا۔

''کیا مسئلہ ہو۔۔۔'' جہاں مقدس کے الفاظ اُسے سامنے دیکھ کر منہ میں ہی رہ گئے تھے، وہیں مقدّم بھی مہینے بھر بعد اُسے سامنے دیکھ کر دل سے مسکرایا تھا۔

''تم؟'' اُسکے منہ سے نکلا۔

''باہر ہی کھڑا رکھو گی؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آجاؤ!'' وہ سنجیدگی سے کہتی سامنے سے ہٹ گئی تو وہ کچھ کچھ حیران ہوتا اندر داخل ہوا۔ لان میں نانی کی گود میں بیٹھا مکرم، اُسے دیکھ کر مچھلی کی طرح اُنکی گود سے نکل کر دوڑتا ہوا اُسکے پاس آیا تھا۔ مقدم نے اُسے گود میں اٹھا لیا، پھر اُسے دل بھر کر پیار کیا۔ نانی بھی اُس سے ملنے وہیں آ گئی، پھر کچھ دیر اُس سے بات چیت کرنے کے بعد چائے بنانے اندر چلی گئیں۔ اِس دوران مقدس خاموش ہی بیٹھی رہی۔

''شادی کی شاپنگ شروع کر دی؟''اُس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''شادی کی شاپنگ؟''اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں! میں نے کہا تو تھا کہ جب میں واپس آؤں گا تو ہم شادی کر لیں گے۔''وہ حیران ہوا۔

''اوہ ہاں! امی ابو آ جائیں۔ کوئی تاریخ طے ہو جائے تو پھر دیکھتے ہیں۔''اُس نے عجیب روکھا پھیکا سا جواب دیا تو مقدّم نے گہری سانس بھر کر مکرم کو گود سے اتارا۔ وہ گھاس پر کھیلنے لگا۔

''کس بات پر ناراض ہو؟''براہِ راست سوال کیا۔

''کسی بات پر نہیں!''نروٹھے انداز میں کہا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ تم ناراض نہیں ہوتی۔''اُس نے شرارت چھپاتے کہا۔

''ہاں! کہا تھا۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ تم ناراض کرنے والے کام کرو۔''اُس نے گھورتے ہوئے کہا تو اب کہ وہ ہنسا۔

''ہنسو مت! مجھے اخلاق بھائی نے کچھ دنوں پہلے ہی بتا دیا تھا سب۔''

''اُس نے بتا دیا یا تم نے زبردستی اُگلوالیا؟''

''بات نہ گھماؤ!''

''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''یعنی میں اتنی سی بھی اہم نہیں ہوں تمہارے لیے؟''ہاتھوں کی چٹکی بنا کر پوچھا۔

''تم بہت اہم ہو میرے لیے، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے کوئی تمہیں نقصان پہنچائے۔''عجیب سی وضاحت دی۔

''پر تم بتا سکتے تھے، بتانے سے نقصان نہیں پہنچتا مجھے۔''اُس نے جتایا۔

''یعنی مجھے وضاحت دینی پڑے گی؟''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو جواباً وہ خاموش رہی۔ وہ ہنسا۔ ناراض ناراض سا انداز پیارا لگا اُسکا۔

اب وہ اُسے سب کچھ بتارہا تھا۔

کبھی کبھار وضاحت ضروری ہوتی ہے۔۔۔

اور وضاحت دینا برا اتنا برا بھی نہیں۔۔۔

----------+---------+--------

''تمہیں تو کلر کرنا بھی نہیں آتا، تمہیں ڈول ہاؤس سجانا بھی نہیں آتا، تمہیں میرے بال باندھنا بھی نہیں آتے۔ تمہیں تو کچھ بھی نہیں آتا بھائی!'' علی ایک ماہ بعد اپنے گھر میں داخل ہوا تو جو پہلی آواز کانوں میں پڑی وہ نشمیہ کی ہی تھی، جو اپنے بھائی کو اُسکی تمام تر نااہلیاں گنوار ہی تھی۔ وہ بیساختہ مسکرایا۔ دل و روح میں جیسے سکون سرائیت کر گیا۔ موسم بھی اچھا تھا، اندر بھی اور باہر بھی۔

اُس نے لاؤنج میں قدم رکھے، جہاں نشمیہ اپنی ڈرائنگ بکس، رنگ برنگے مارکر اور پینٹ پھیلائے اپنے بھائی کو ڈرائنگ سکھار ہی تھی۔ اور اُسکے بھائی کو چار و ناچار یہ کرنا پڑ رہا تھا۔

''تمہیں بھی تو فٹبال نہیں آتی؟'' گھر کے خاکے میں رنگ بھرتے احمد نے چڑے ہوئے انداز میں کہا۔ یہ اُسکا ناپسندیدہ ترین کام تھا۔

''پر میں تمہارے ساتھ کھیلتی ہوں نا!'' اس نے یاد دلایا تو خاموشی سے دونوں کو دیکھتا علی مسکرایا۔ یقیناً دونوں بہن بھائیوں میں کوئی معاہدہ ہوا تھا۔

''ہاں تو میں بھی تو کلر کر رہا ہوں نا!'' وہ مزید جھنجھلایا۔

''میں فٹبال اچھا کھیلتی ہوں، پر تم ڈرائنگ بالکل اچھی نہیں کرتے۔'' اُس نے جتایا۔

''تم کب اچھا فٹبال کھیلتی ہو؟ انتہائی برا کھیلتی ہو تم۔'' احمد نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

''میں تو چھوٹی ہوں نا!'' اُسکا پسندیدہ جملہ۔ اِس بار علی بے ساختہ ہنسا تو دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

''بابا!'' دونوں ایک ساتھ چیخے تھے، اور اگلے ہی لمحے دونوں دوڑتے ہوئے اُسکے پاس آئے تھے۔ نشمیہ بھی۔۔ اور احمد بھی۔۔۔

علی نے دونوں کو گلے لگا کر خوب چوما۔

''بابا آگئے۔۔۔ میرے بابا آگئے!''نشمیہ کی خوشی ہی کم نہیں ہو رہی تھی۔

''کیسے ہو میرے بچوں؟''اُس نے دونوں کو بھینچتے ہوئے کہا تو دونوں ہنسنے لگے۔شور کی آواز سن کر سفیر صاحب بھی وہیں چلے آئے۔

''علی؟''اُسے دیکھ کر پہلے حیران ہوئے، پھر خوشی سے اُسکو آگے بڑھ کر گلے لگایا۔

''شکر ہے تم صحیح سلامت واپس آگئے۔وہ قاتل ملا؟ کیا اُسے ڈھونڈ لیا ایف آئی اے نے؟''وہ ایک کے بعد ایک سوال کرنے لگے۔

''سب بتاؤں گا ابّا! آپ پریشان نہ ہو۔سب ٹھیک ہے اب۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے ہاں! میں بھی یہیں سوال کرنے کھڑا ہو گیا۔''وہ کہتے ہوئے سامنے سے ہٹے تو علی بھی صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ملازم لڑکا اُسکا سامان گاڑی سے نکال رہا تھا۔نشمیہ اور احمد اُسکے دائیں بائیں جم کر بیٹھ چکے تھے۔اور سفیر صاحب سامنے تھے۔اُس نے نظریں گھما کر سارے گھر کا جائزہ لیا۔پر فاطمہ آفندی کہیں نظر نہ آئی۔وہ نظر نہ آئی تو دل بے چین ہوا۔

''تمہاری امی کہاں ہے؟''اُس نے آہستگی سے احمد سے پوچھا۔

''وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔''اُس نے بتایا تو علی نے اثبات میں سر ہلایا، پھر سفیر صاحب کو دیکھا جو بغور اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''فاطمہ کی طبیعت کیسی ہے اب؟''اُس نے اُن سے پوچھا۔

''خود پوچھ لو۔''اِس جواب پر وہ بھونچکا رہ گیا۔

''میں پوچھ لوں گا۔بس! جاننا چاہ رہا تھا کہ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا۔''اُس نے گڑ بڑا کر وضاحت دی۔

''تو یہ بھی اُسی سے جان لو۔''انہوں نے صاف ہری جھنڈی دکھائی تو اُس نے دانت پیسے۔

''مجھے بھوک لگی ہے، کھانا کھانا ہے۔''اُسی لمحے نشمیہ نے اعلان کیا۔

''مجھے بھی لگی ہے۔کھانے میں کیا ہے؟''علی نے بھی اُسکا ساتھ دیا۔

''امی نے بریانی بنائی ہے۔''احمد چہکا تو علی مسکرایا۔

''پھر تو میں نہا کر آتا ہوں۔سب ساتھ مل کھائیں گے، بریانی کو انتظار نہیں کروانا چاہیے۔''وہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔پھر اُنہیں لاؤنج میں چھوڑتا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔سیڑھیوں کے پاس ایک مرتبہ رک کر اوپر ضرور دیکھا کہ شاید فاطمہ نظر آ جائے پر وہ نظر نہ آئی۔ وہ بھی سر جھٹک کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

ابھی اُس نے کمرے میں قدم رکھے ہی تھے کہ پلنگ کی دوسری جانب بنی شیشے کی کھڑکیوں کے پاس فاطمہ جائے نماز پر بیٹھی نظر آئی۔ہلکے پیازی رنگ کے لباس میں اُسکا چہرہ دوپٹے میں لپٹا چمک رہا تھا، وہ بڑی یکسوئی سے دعا مانگ رہی تھی۔اُسے دیکھ کر علی ٹھٹک کر رکا۔وہ سمجھا تھا کہ فاطمہ اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی ہو گی، پر وہ تو یہاں تھی۔ اُسکے پر سکون اور پر نور سے چہرے کو وہ یک ٹک دیکھتا رہا۔یہاں تک کہ وہ دعا ختم کر کے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرتی اٹھی، پھر جائے نماز طے کرتی مڑی تو نظریں علی پر پڑیں۔

وہ پہلے حیران ہوئی، پھر بے یقین۔۔۔

اور جب یقین آیا تو گڑبڑائی۔۔۔

''وہ مم۔۔۔میں۔۔۔اصل میں۔۔۔''سمجھ نہیں آیا کہ علی کو اپنی یہاں موجودگی کا کیا جواب دے؟

''تم کب آئے؟''کچھ سمجھ نہ آیا تو یہی پوچھ لیا۔

''کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔جب وہ جا رہا تھا تو فاطمہ بہتر حالت میں تھی، اب واپس آیا تھا تو وہ بہترین ہو چکی تھی۔پہلے سے صحتمند، تندرست، چمکتے ہوئے شاداب چہرے کے ساتھ۔

''وہ نشمیہ۔۔۔اکثر تمہارے کمرے میں رہنے کی ضد کرتی تھی تو میں بھی یہیں آ گئی تھیں۔''اُس نے خود ہی وضاحت دی۔

''کوئی بات نہیں! تم کیسی ہو؟''اِس سوال پر وہ حیران ہوئی۔جو اُسکے لیے بڑی بات تھی، وہ علی کے لیے کچھ نہ تھی۔

''بہتر ہوں!''اُس نے سر ہلاتے کہا۔'' کھانا لگا دوں؟''پھر پوچھا۔

''ہاں! میں چینج کر کے آتا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے الماری کی طرف بڑھا تو پیچھے کھڑی فاطمہ نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ پر اب دیر ہو چکی تھی۔

علی نے الماری کھولی تو نیچے ریک میں چند جوڑے فاطمہ کے بھی رکھے نظر آئے۔ اُس نے خاموشی سے اپنے کپڑے نکالے اور پلٹ کر باتھروم کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے دیکھا تھا یا دیکھ کر نظرانداز کر دیا تھا؟ فاطمہ کو نہیں معلوم تھا۔ پر وہ بری طرح شرمندہ تھی۔

پر علی کو معلوم تھا، اُس نے دیکھا تھا۔ اُس نے سنگھار میز پر رکھی فاطمہ کی کنگھی، اُسکی کیچر اور اُسکی کچھ دوائیں بھی دیکھی تھیں۔ وہ مستقل یہاں رہ رہی تھی۔ علی کو برا نہیں لگا، وہ نشمیہ کی ضد اچھے سے جانتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ نہادھو کر باہر آیا تو کمرہ خالی تھا۔ نہ فاطمہ وہاں تھی نہ اُسکی کوئی شے۔ اُس نے بلاارادہ ہی الماری کھولی تو اب اُسکے جوڑے بھی وہاں نظر نہ آئے۔ مطلب وہ چلی گئی تھی؟ اُسکا یا اُسکی چیزوں کا یہاں ہونا علی کو برا نہیں لگا تھا، پر اُسکا جانا ضرور لگا تھا۔

باہر آیا تو میز پر کھانا لگ چکا تھا۔ بریانی کی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ فاطمہ کھانا لگا کر بیٹھی تو علی بھی اُسکے ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر برابر میں ہی بیٹھ گیا۔ وہ تو ساکت ہی رہ گئی۔ سفیر صاحب پہلی مرتبہ مسکرائے، پر وہ بھی بے نیازی سے بچوں کی پلیٹوں میں کھانا نکالنے لگا۔ بچوں کے بعد اُس نے ایک اور پلیٹ میں کھانا نکالا اور فاطمہ کے آگے رکھ کر اب اپنے لیے کھانا لینے لگا۔ ایسے جیسے روز ہی یہ کرتا ہو۔ وہ چپ چاپ بیٹھی آنسو اپنے اندر اتارتی رہی تھی۔ اُس نے کیا گنوایا تھا، یہ احساس اُسے روز ستاتا تھا۔

''احمد! نشمی! دونوں تیار رہنا۔ ہم کھانے کے بعد کہیں چلیں گے۔'' کھانے کے دوران اُس نے دونوں بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کہاں؟'' احمد نے پوچھا۔

''کیا ڈال ہاؤس لینے جائیں گے؟'' نشمیہ اور اُسکی خواہشات۔

''سرپرائز ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''مجھے بھی نہیں بتاؤ گے؟'' سفیر صاحب نے پوچھا۔

''سرپرائز خراب ہو جائے گا ابّا!''علی سے پہلے نشمیہ نے سمجھداری سے کہا تھا۔وہ ابھی تک اُنہیں دادا نہیں کہتی تھی۔

''میری بیٹی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔''علی نے طرفداری کی۔

''تو پہلے تھوڑا آرام کر لو،ابھی ہی تو اتنے لمبے سفر سے آئے ہو۔''انہوں نے محبت سے کہا۔

''گھر آتے ساتھ ہی میری تمام تھکن اتر گئی ہے۔اور ذرا ضروری کام ہے۔''اُس نے نرمی سے کہا۔

''دیکھتے ہیں بھئی کہ کیا سرپرائز ہے۔''وہ بھی کہتے ہوئے کھانے کی جانب متوجہ ہو گئے۔

جبکہ فاطمہ خاموش ہی رہی تھی۔

شاید اُسکی اہمیت اب اتنی ہی تھی۔

----------+---------+--------

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا؟''رات جب ولید سو گیا تو اُسکے ننھے ہاتھوں کو چومتے بشریٰ نے نوید سے پوچھا تھا۔

''میں خود انجان تھا۔''اُس نے ولید کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔وہ قدرتی طور پر بشریٰ کے ساتھ پرسکون ہو گیا تھا۔

''اللہ نے کیسے نواز دیا ہے؟یقین اب تک نہیں آ رہا۔ایسا لگتا ہے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔کہیں کوئی جگا نہ دے۔''اُس نے خواب کی سی کیفیت میں کہا۔

''اللہ نہ کرے کہ یہ خواب ہو۔''نوید دہل کر بولا۔

''تمہارا شکریہ نوید!''اُس نے یکدم ہی کہا تو وہ حیران ہوا۔

''کس لیے؟''وہ حیران ہوا۔

''تم نے مجھے کسی لمحے اکیلا نہ چھوڑا۔اُس وقت بھی جب میں ذہنی مریضہ تھی۔''اُس نے کہا۔

''جب میں بہت برا تھا،جب میں کچھ بھی نہ تھا۔کیا تم نے مجھے چھوڑ دیا تھا؟''اُس نے پوچھا تو وہ خاموش رہی۔

''نہیں چھوڑا تھا۔'' نفی میں سر ہلاتے خود ہی جواب بھی دیا۔ ''تم نے میرا اچھا برا ہر رویہ سہا تھا۔ میرے برے دنوں میں میرا ساتھ دیا۔ پھر میں کیسے چھوڑ دیتا تمہیں؟ اور پھر تم میرا واحد اثاثہ تھی۔ میری پوری دنیا! میں کیسے تم سے الگ ہوتا؟'' اُس نے پہلی بار اپنی زندگی میں اُسکی اہمیت کا اظہار کیا تھا۔ وہ مسکرائی، پھر ولید کو دیکھنے لگی۔

''تم خوش ہو؟'' نوید نے پوچھا۔

''معید کی موت کا غم ہے، اور کبھی ختم بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاں! پر ولید کے آنے سے بہت کم ہو گیا ہے۔ میں رب کی ناشکری نہیں کر سکتی۔ اُس نے میرا بیٹا مجھے واپس دے دیا۔'' اُس نے سچ کہا۔

''اب کبھی نہیں روؤ گی نا؟'' نوید نے پوچھا تو اُس نے نم آنکھوں سے مسکراتے نفی میں سر ہلایا۔ نوید نے ایک اور خوبصورت منظر آنکھوں میں قید کر لیا۔

''ارے! تمہارے پاس پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہیں؟'' اُس کو اچانک ہی خیال آیا تو سیدھا ہوا۔

''نہیں! کس نے کہا نہیں ہے؟ بہت سے اچھے جوڑے رکھے ہیں۔'' اُس نے فوراً سے آنسو پونچھتے جواب دیا۔ کل نوید کی والدہ نے اپنے پوتے کی واپسی کی خوشی میں پورے خاندان کی دعوت رکھ دی تھی۔ اسی بہانے بشریٰ کے گھر والے بھی ولید سے مل لیتے۔

''بالکل نہیں! کل تم نیا جوڑا پہنو گی۔ اٹھو! ہم شاپنگ پر چلتے ہیں۔'' نوید کہتے ہوئے واقعی کھڑا ہو گیا تو وہ گڑبڑائی۔

''پر یہ سو رہا ہے ابھی!''

''اُٹھا دو اسے۔ اسکے لیے بھی شاپنگ کریں گے۔۔۔ ڈھیر ساری!'' اُس نے کہا۔

''ہاں! میں اِسکے لیے بہت سے کپڑے لوں گی۔ اور کھلونے بھی اور۔۔۔'' وہ خوشی خوشی گننے لگی اور نوید مسکراتے ہوئے اُسے سنے گیا۔ اِس یقین کے ساتھ کہ اب زندگی سدا یونہی رہے گی۔

----------+---------+--------

دروازے پر ہوتی دستک پر انہوں نے ٹی وی پر چلتی خبروں کی آواز کم کی اور پلٹ کر کچن کی جانب دیکھا۔ سب مصروف تھے، یقیناً دروازہ انہوں نے ہی کھولنا تھا۔ وہ خاموشی سے اُٹھے اور دروازے کی جانب آئے۔ جیسے ہی دروازہ کھولا، اُنکی آنکھیں ساکت رہ گئیں۔ جو انھوں نے دیکھا تھا، اُس پر یقین نہیں آیا۔

''تم؟'' لبوں سے آہستہ سے آواز نکلی۔

''ناناابو! میں آگئی۔'' اِس سے قبل کہ علی کوئی جواب دیتا، نشمیہ اُسکے پیچھے سے چلاتی ہوئی نکلی اور دوڑ کر اپنے نانا کے گھٹنوں سے لگ گئی۔

''نشمی!'' انہوں نے چہرہ نیچے کر کے دیکھا تو وہ تھوڑی اُنکے گھٹنے پر ٹکائے، معصوم آنکھوں سے اُنہیں ہی دیکھ رہی تھی۔ انکا دل بھر آیا، فوراً جھک کر اُسے گود میں اٹھالیا۔

''میری گڑیا!'' پھر اُسے خوب پیار کیا۔ علی کی سانسیں بحال ہوئیں۔ جو کام اُسے مشکل لگ رہا تھا، وہ اُسکی بیٹی نے آسان کر دیا تھا۔

''نانا!'' علی نے اشارہ کیا تو احمد بھی جھجھکتے ہوئے آگے بڑھا۔

''احمد؟ تم احمد ہو؟'' انہوں نے بے یقینی سے دیکھا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب آخری بار دیکھا تھا تو وہ چار سال کا چھوٹا سا بچہ تھا۔ فاطمہ نے احمد کو علی سے لینے سے قبل ہی گھر چھوڑ کر ہوسٹل میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ پر احمد کے ساتھ چلے آنے کے بعد اُس نے وہ خط لکھ کر نشمیہ کو اُنکے حوالے کیا اور کہا کہ آخری بار اُسکا ایک کام کر دیں۔ نشمیہ کے لیے۔۔۔ اور صرف اُسی کے لیے وہ راضی ہو گئے تھے۔

''میرا احمد!'' انہوں نے بایاں ہاتھ اُسکے سر پر رکھا اور اُسے اپنے سینے سے لگالیا۔

''کتنے لمبے ہو گئے ہو تم؟'' اُنکی آنکھیں دھندلانے لگی تھیں۔ علی مسکرایا۔ یہ نانا نانی، اور دادا دادی بھی کتنی عجیب مٹی سے بنے ہوتے ہیں؟ اپنے بچوں سے جتنے ناراض ہوں اور انکی اولاد سے ذرا بھر بھی ناراض نہیں رہ پاتے۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں؟'' علی نے ادب سے پوچھا تو شہیر صاحب کو یاد آیا کہ وہ بھی یہاں ہے۔

''ہاں! آجاؤ۔'' انہوں نے راستہ دیا تو وہ اندر آیا۔ پھر وہ اُن سب کو لیے اپنے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ نشمیہ تو نانا کی گود سے ایسا چپکی کہ پھر اُتری ہی نہیں۔

''تم کونسی کلاس میں آ گئے ہو احمد؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کلاس فور!'' اُس نے بتایا۔

''ماشاءاللہ! تم تو بہت سمجھدار ہو گئے ہو۔'' انہوں نے پیار سے کہا۔

''میں بھی ہوں سمجھ۔۔۔'' سمجھ سے آگے نشمیہ کو سمجھ نہ آیا کہ کہنا کیا ہے؟ شہیر صاحب اور علی بے ساختہ ہنس دیئے۔

''میری بیٹی نے مجھے یاد کیا؟'' انہوں نے اُس سے پیار سے پوچھا۔

''ہاں! بہت سارا۔۔۔'' اُس نے دونوں بازو پھیلا کر بہت سارا کی مقدار بتائی۔

''میں نے بھی!'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر سامنے بیٹھے علی کو دیکھا۔

''تم تو اسے یتیم خانے نہیں چھوڑنے والے تھے؟'' انہوں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا تو علی مسکرایا۔ غالباً وہ ناراض تھے۔

''میں غصّے میں تھا، صدمے میں تھا۔ لیکن شکر کہ میں نے اپنی عقل نہیں کھوئی۔'' اُس نے وضاحت دی تو وہ چپ رہے۔

''نشمیہ آپکو یاد کرتی ہے۔ میں آپکا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری بیٹی کو اتنی محبت سے رکھا۔'' اُس نے دل سے کہا تھا، پر وہ افسردہ سے ہو گئے۔

''میں نے اسے محبت دی، پر وہ مقام نہ دے سکا جو ایک بیٹی کو اپنے باپ کے گھر میں ملتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ اب اپنے گھر میں ہے۔'' انہوں نے نشمیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے کہا۔

''اپنی بیٹی کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اِس سوال پر وہ حیران ہوئے۔

''کیا مطلب؟''

''آپ جانتے ہیں کہ میں نے فاطمہ سے شادی کر لی ہے۔'' اُس نے بتایا۔

''جانتا ہوں۔'' فاطمہ کے ذکر پر اُنکے چہرے پر ناگواری در آئی تھی۔

''تو آپ کیوں نہیں آئے اُس سے ملنے؟ وہ انتظار کرتی رہی تھی آپکا۔'' علی نے کہا۔

''تمہارا دل اُسے معاف کرنے پر کیسے تیار ہوا، مجھے نہیں معلوم! پر میرا دل اتنا بڑا نہیں ہے۔'' انہوں نے سختی سے کہا۔

''میں نہیں مانتا۔'' اِس غیر متوقع جواب پر انہوں نے حیرت سے علی کو دیکھا۔

''معاف میں بھی نہ کرتا اُسے، پر میں نے اپنے بچوں کے لیے، اور صرف اُنکی محبت میں اُسے واپس اپنایا ہے۔ جب میں اپنے بچوں کی محبت میں ایسا کر سکتا ہوں تو آپ اپنی اولاد کی محبت میں اُسے معاف نہیں کر سکتے؟ میں نہیں مانتا کہ جس بیٹی کے بچوں سے آپکو اتنی محبت ہے، اُس بیٹی سے آپکو محبت نہ ہو۔ جبکہ وہ موت کے منہ سے واپس آئی ہے۔'' اِس بات پر وہ ٹھٹھکے۔

''موت کے منہ سے؟'' اُنکی زبان لڑکھڑائی تھی۔

''ہاں! اُسے ٹی بی ہو گیا تھا۔ پھیپھڑوں پر اثر پڑا تھا، سانس لینے میں بھی دشواری ہوتی تھی، کھانستی تھی تو خون تھوکتی تھی۔ لیکن اب الحمد اللہ بہت بہتر ہے۔ علاج اب بھی چل رہا ہے، لیکن خطرے والی بات نہیں ہے۔'' اِس بات پر وہ چپ کے چپ رہ گئے۔

''میں جانتا ہوں آپ اُس سے ناراض ہیں۔ پر نفرت انسان کے گناہ سے کرنی چاہیے، انسان سے نہیں۔ کیونکہ اگر ہم انسان سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں تو، جب وہ گناہ چھوڑتا ہے، تب بھی ہم اُسے معاف کرنے پر، اور بخشنے پر تیار نہیں ہوتے۔ جبکہ ایک معافی تو سب کا حق ہے۔ اُس نے جو بھی کیا، پر اب وہ بدل چکی ہے۔ اپنے کیے کا نقصان بھی اٹھا چکی ہے۔ اُسے معاف کر دیں، سدھرنے کا ایک موقع دے دیں۔ پلیز انکل!'' اُس نے جیسے التجا کی تھی۔

''پلیز نانا!'' حالانکہ نشمیہ کو سمجھ کچھ نہ آیا تھا کہ کیا گفتگو چل رہی ہے؟ پر اپنے باپ کی بات دہرانا اُس پر فرض تھا۔ وہ نم آنکھوں سے مسکرا دیئے۔

فاطمہ ابھی عشاء پڑھ کر فارغ ہوئی ہی تھی کہ پورچ میں علی کی گاڑی داخل ہوتی دکھائی دی۔ وہ خاموشی سے میز پر کھانا لگانے لگی۔ پتہ نہیں وہ لوگ کہاں گئے تھے؟ اور پتہ نہیں کھانا کھا کر بھی آئے تھے یا نہیں؟ اُسے لاؤنج میں نشمیہ کے دوڑنے اور علی کی اُسے ٹوکنے کی آواز آنے لگی تھی۔ گھر پھر سے جاگ اٹھا تھا۔

وہ کھانا میز پر لگا کر پلٹی تو ساکت رہ گئی۔ آنکھوں نے یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ شہیر صاحب سامنے تھے۔ بالکل سامنے۔۔۔

''اب۔۔۔ابّو!'' اُسکے لب ہلے۔ شہیر صاحب کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے نمودار ہونے لگے۔

''ابّو!'' وہ بھرائی آواز میں کہتی اُنکے پاس آئی، وہ اُنکی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔

''ابّو۔۔۔'' وہ اِس ایک لفظ کے آگے کچھ کہہ ہی نہ پاتی تھی۔ بس بلکتے چہرے کے ساتھ انہیں اِس اُمید پر دیکھ رہی تھی کہ وہ خود ہی سمجھ جائیں۔

سفیر صاحب شاید کہیں جانے کے لیے تیار باہر آئے تھے، پر اُن دونوں کو وہاں دیکھ کر وہ بھی حیرت سے رک گئے۔

''میری بیٹی!'' انہوں نے آگے بڑھ کر فاطمہ کو سینے سے لگایا اور اُس نے ایک زور کی ہچکی بھری اور پھر تڑپ تڑپ کر رو دی۔

بالآخر انہوں نے اُسے معاف کر دیا تھا۔ سفیر صاحب نے علی کو دیکھا۔ تو یہ تھا اُسکا سرپرائز؟ پھر اُس کے قریب آئے اور اُسکے گرد بازو پھیلا کر اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اِس ایک لمس میں فخر، مان اور غرور کے تمام تاثرات یکجا ہو گئے۔ علی کا دل آج مکمل ہو گیا۔ اُسکے باپ کو اُس پر فخر ہوا تھا۔ بے حد فخر۔۔۔۔

شہیر صاحب کے سینے سے لگی روتی فاطمہ نے ایک نظر سرخ آنکھوں سے دور کھڑے علی کو دیکھا۔ پھر عقیدت و تشکر سے سر ہلا دیا۔ جیسے اُسکا شکر ادا کر رہی ہو۔

چیزیں جگہ پر آ گئی تھیں، رات فاطمہ نے ضد کر کے شہیر صاحب کو کھانے پر روک لیا۔ سفیر صاحب کو کہیں جانا تھا تو وہ معذرت کر کے چلے گئے۔ کھانے کے بعد علی، شہیر صاحب کو خود گھر چھوڑنے گیا تھا۔ وہ دونوں کو گھر آنے کی دعوت، اور فاطمہ کو ڈھیر ساری دعاؤں سے نواز کر چلے گئے۔

فاطمہ کے دل میں آج علی کا مقام اور اونچا ہو گیا تھا، اتنا زیادہ کہ وہ اُس تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ اور وہ سمجھ رہی تھی کہ اُسکی اہمیت نہیں ہے۔

ابھی رات کے گیارہ بج رہے تھے کہ اُسکے موبائل پر کال آنے لگی۔اُس نے اٹھا کر دیکھا تو علی کی کال تھی۔وہ حیران ہوتی اُٹھ بیٹھی، برابر میں نشمیہ سوئی ہوئی تھی۔احمد اپنے کمرے میں تھا۔اُس نے فون اٹھایا اور آہستگی سے اُٹھ کر کنارے پر ہوئی۔

''ہیلو!''

''کیا تم جاگ رہی ہو؟''علی کا سوال عجیب سا تھا۔اُسے ہنسی آئی، پر ضبط کر گئی۔

''ہاں! جاگ رہی ہوں۔''فوراً سنجیدگی سے کہا۔

''باہر آسکتی ہو؟ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''اُس نے کہا تو وہ حیران ہوئی۔

''آتی ہوں۔''وہ فون کاٹنے لگی کہ علی یکدم ہی بولا۔

''چادر لیکر آنا۔''اِس بات پر وہ مزید حیران ہوتی، چادر ہاتھ میں لیے باہر آ گئی۔ ریلنگ سے نیچے جھانک کر دیکھا تو علی لاؤنج میں کھڑا نظر آیا۔

''کیا ہوا؟''اُس نے نیچے آتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

''باہر چلو میرے ساتھ! کچھ بات کرنی ہے۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''بچے گھر میں اکیلے ہیں۔''

''ابّا آ گئے ہیں۔''اُس نے پیچھے کی جانب اشارہ کیا تو فاطمہ نے پلٹ کر دیکھا۔وہ اپنے کمرے میں بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔علی کو دیکھا تو انگوٹھا اٹھا کر سب ٹھیک ہے کا اشارہ کر دیا۔اُس نے ناسمجھی سے انھیں، پھر علی کو دیکھا۔

''چلو آ جاؤ!''وہ کہتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گیا۔وہ بھی خاموشی سے اُسکے پیچھے آئی تو وہ دروازے پر ہی کھڑا تھا۔فاطمہ بھی دروازے سے باہر نکل کر گلی میں آ گئی۔علی نے دروازہ بند کر دیا۔اور دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے،اُسکے ساتھ پیدل چلنے لگا۔گلی ویسے تو خالی ہی تھی، پر اکا دکا لوگوں نے مڑ کر بغور دیکھا ضرور تھا۔اِس لمحے وہ بری طرح شرمندہ ہوا تھا۔اُس نے ایسی ہی ایک رات کو فاطمہ کو دھکے مار کر گھر سے نکالا تھا،اِس تماشے کے یہ لوگ گواہ تھے۔کچھ چیزوں کو وہ چاہ کر بھی تبدیل نہیں کر سکتا تھا، سوائے سدھارنے کے۔

گلی سے نکل کر دونوں باہر آ گئے، سامنے سوسائٹی کا پارک تھا، اتنا رش نہیں تھا پر خالی بھی نہ تھا۔ فاطمہ گاہے بگاہے اُسے نظریں اٹھا کر دیکھ لیتی جو پورے راستے خاموش رہا تھا۔

''علی!'' بالآخر جب پارک میں آکر بھی وہ خاموش رہا تو، اُس نے پکارا۔

''ہونہہ!'' وہ جیسے کسی خیال سے چونکا۔

''تمہارا شکریہ!'' وہ ہچکچائی، پر شکریہ کرنا ضروری تھا۔ ٹریک پر چلتا علی رکا اور مکمل طور پر اُسکی طرف گھوم گیا۔ جامن کا گھنا درخت اُنکے سروں پر آ گیا۔

''تمہارے پاس شکریہ اور معافی کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہے؟'' اس نے ہلکے پھلکے سے انداز میں پوچھا تو وہ حیران رہ گئی۔

''کیا مطلب؟'' اُس نے حیرت سے کہا۔

''گول گپے کھاؤ گی؟'' اُس نے بالکل غیر متوقع سوال کیا۔ وہ ساکت نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔

''میں لیکر آتا ہوں۔'' وہ اُسے محو حیرت چھوڑے گول گپّے کے اسٹال کی جانب چلا گیا۔ وہ کچھ حیران پریشان سی، درخت کے نیچے رکھی بینچ پر بیٹھ گئی۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی اُسکے چہرے کو منور کر رہی تھی۔ چادر اُس نے اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ کچھ دیر بعد علی واپس آ گیا، اُسکے ہاتھوں میں گول گپے کی ایک ہی پلیٹ تھی۔ اُس نے درمیان میں رکھ دی اور بینچ پر بیٹھ گیا۔

''یہ۔۔۔'' وہ کچھ بولنا چاہتی تھی۔

''تم کھا سکتی ہو۔ ڈاکٹر نے منع نہیں کیا ہے۔'' علی نے کہتے ہوئے ایک گول گپا اٹھایا اور منہ میں ڈال لیا۔

''ہمم۔۔۔ نائس!'' اُس نے تعریف کی۔ اُسکے انداز ہی نرالے تھے آج تو۔۔۔

''میں نے چار سال بعد کھایا ہے اسے۔ وہ اور بات ہے کہ میں نے تمہاری بیٹی کی پلیٹ سے کھانے کی کوشش کی تھی پر اُس نے چکھنے بھی نہ دیا۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے اُسے دیکھا۔ براہِ راست۔۔۔۔

فاطمہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو جمع ہونے لگے۔ لب کپکپائے، آنکھیں ڈبڈبائیں۔ پھر اس اُس سر جھکا لیا۔

''کیا ہوا؟'' علی نے پوچھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اُسے کیا ہوا ہو گا؟ پر پھر بھی چاہتا تھا کہ وہ بولے۔

''میں نے بہت کچھ گنوا دیا علی!'' اُس نے پہلی بار اپنے دل کی بات ایسے کہی کہ اُسے علی سے جھجک نہ تھی۔ جیسے دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ تو تھا ہی نہیں۔ وہ مسکرایا۔

''میں نے بھی!'' اُس نے آہستہ سے اعتراف کیا تو اُس نے نم آنکھیں اٹھا کر اُسے دیکھا۔

''اچھا! چلو یہ ختم کرو۔ ہمیں گھر بھی جانا ہے۔'' اُس نے پلیٹ اُسکے سامنے کی۔ ایسے جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''تمہیں تو مجھ سے بات کرنی تھی۔'' اُس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''گھر جا کر کر لیں گے۔ لوگ گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''تو ہم کونسا ٹین ایجر ہیں جو سب گھور رہے ہیں؟'' اُس نے بیساختہ ہی کہا تو علی نے غور سے اُسے دیکھا اور پھر ہنس دیا۔

''میں لگ رہا ہوں گا بے شک! پر تم تو نہیں لگتی نا دو بچوں کی ماں۔'' ایک بار پھر فاطمہ کی آنکھیں نم ہوئیں۔ تعریف۔۔۔ ستائش۔۔۔ یہی وہ شے تھی جسکے لیے وہ ترستی تھی کبھی۔

''تم ایسے کیوں کر رہے ہو؟'' اُس نے اچانک پوچھا۔ اُسے نہ اپنی کیفیت سمجھ آ رہی تھی نہ علی کا انداز۔

''کیسے کر رہا ہوں؟'' اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''جیسے نئی نئی شادی کے بعد کرتے تھے۔'' اُس نے فوراً یاد دلایا۔

''ہماری نئی نئی شادی ہی ہوئی ہے۔'' اُس نے شکل پر معصومیت سموتے کہا۔ اِس بار فاطمہ ہنسی۔۔۔ بیساختہ۔۔۔ نم آنکھوں والے چہرے کی ہنسی دلکش تھی۔

''تم کمرے سے اپنا سامان کیوں لے گئی؟'' اُس نے عام سے انداز میں پوچھا تو وہ حیران ہوئی۔ وہ باخبر تھا۔

''میں۔۔۔ وہ تو بس کچھ دنوں کے لیے۔۔۔ نشمیہ کی وجہ سے۔۔۔'' اُس نے بے ربط سے جملوں میں بات مکمل کی۔

"پر وہ کمرہ تو تمہارا ہی ہے۔" اب کہ فاطمہ نے جواب نہیں دیا۔

گول گپے ختم ہو گئے تو دونوں اُٹھ گئے، پھر پیدل پیدل چلتے گھر کی طرف آنے لگے۔اِس مرتبہ دونوں کے درمیان خاموشی نہ تھی۔وہ بچوں کے متعلق پوچھتا، اور وہ اُسکی غیر موجودگی میں ہوئے واقعات اُسے بتانے لگتی۔ جیسے وہ تو روز ہی ایسا کرتے ہوں۔

گھر میں داخل ہوئے تو علی لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔دوسری کرسی کی طرف اشارہ کر کے اُسے بھی بیٹھنے کو کہا۔وہ بیٹھ گئی تو درمیان میں ایک کرسی جتنا فاصلہ رہ گیا۔ علی اٹھا، اپنی کرسی کھینچ کر اُسکے برابر میں لگائی اور بیٹھ گیا۔

"فاطمہ!" اُسے پکارا۔ دل سے۔۔۔ پورے دل سے۔۔۔

"ہونہہ!" آنکھوں کو کوئی مسئلہ تھا شاید۔ پانی وہاں پھر سے جمع ہونے لگا۔اُس نے کتنے عرصے بعد اتنے پیار سے پُکارا تھا۔

"میں ہنسنا نہیں جانتا تھا۔ بہت تلخ زندگی تھی میری۔ بہت محدود سوچ تھی۔ پھر تم میری زندگی میں آئی۔اور تم نے مجھے ہنسنا سکھایا۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں خوشیاں کیسے ڈھونڈتے ہیں؟ میں نے تم سے سیکھا تھا۔" رات کے جامد سناٹے میں، خاموش لان میں صرف علی کی ہی آواز تھی۔

"لیکن میں نے اپنی خوشی، اپنی نعمتیں اپنے ہاتھوں سے گنوائی۔ میں ناشکرا تھا، ناقدرا تھا۔"

"علی!" اُس نے کچھ کہنا چاہا پر اُس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"میں یہاں یہ حساب کرنے نہیں بیٹھا کہ کون کتنا غلط تھا؟ یا کس کا جرم زیادہ تھا اور کس کا کم؟ میں یہاں صرف اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے بیٹھا ہوں۔ مجھے کرنے دو۔ مجھے اپنے خوابوں کی قربانی تم سے نہیں مانگنی تھی، مجھے تمہاری خوشیوں کو اپنے خوابوں کے بھینٹ نہیں چڑھانا چاہیے تھا۔ اگر میں ایک شادی شدہ زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لائق نہیں تھا، تو مجھے شادی ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو جاتا؟ ابّا ناراض رہتے مجھ سے؟ تو وہ تو تم سے شادی کرنے کے بعد بھی مجھ سے ناراض ہی تھے۔ کونسا فرق پڑ جاتا؟ اور اگر کر ہی لی تھی شادی، تو مجھے نبھانا بھی تھا۔ پر مجھے نبھانا ہی نہ آیا فاطمہ!" اُسکی آواز بھرائی۔ "تمہارے جائز مطالبات پر، چھوٹی چھوٹی

خواہشات پر میں نے تمہیں ایسے شرمندہ کیا جیسے تم نے کوئی بے جا مطالبہ کر دیا ہو۔ حالانکہ تم نے مجھ سے کبھی کچھ نہ مانگا تھا۔ کبھی بھی نہیں! صرف اتنا کہا تھا کہ اپنی زندگی سے تھوڑا سا وقت مجھے بھی دے دینا۔'' اُسے یاد تھا۔۔سب یاد تھا۔۔۔

''اور میں نے وقت ہی نہیں دیا۔ میں سمجھتا رہا کہ پیسہ کما کر میں تم سب کو بہترین زندگی دے دوں گا۔ لیکن جب تک پیسہ آیا تب تک میں نے سب کھو دیا۔اور میں مزید بھی گنوا دیتا اگر۔۔۔'' وہ رکا اور اُسے دیکھا۔

''اگر تم نشمیہ کو میرے پاس واپس بھیج کر میری زندگی پر احسان نہ کرتی۔ ''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''میں نے احسان نہیں کیا، اپنی غلطی سدھارنی چاہی تھی۔''اُس نے کہا۔

''پر تمہاری بیٹی نے مجھے سدھار دیا۔'' وہ ہنسا، تو وہ بھی مسکرائی۔

''دس سال قبل تم نے مجھے ہنسنا سکھایا تھا۔اور آج دس سال بعد تمہاری بیٹی نے بھی وہی کام کیا، لیکن۔۔۔'' وہ رک گیا۔

''لیکن؟''اُس نے چہرہ اُٹھا کر پوچھا۔

''تمہاری کمی ہے فاطمہ!''فاطمہ کا دل جیسے رک گیا۔

''میں تمہارے ساتھ ہنسنا چاہتا ہوں، پھر سے تمہارے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔ میرا گھر تم سے ہی تھا اور تم سے ہی ہے، اور تم ہی مکمل کر سکتی ہو۔''اُس نے خواہش کی، اور پوری سچائی سے کی۔

''میں؟ میں تو۔۔۔''اُس نے کچھ کہنا چاہا۔اور علی سمجھ گیا۔

''چھوڑ دو پرانی باتوں کو، بھول جاؤ اُنہیں۔ پہلے میں نے مستقبل کی فکر میں زندگی برباد کی تھی، اب ماضی کے پچھتاؤں میں زندگی نہ گزارو۔ زندگی بہت چھوٹی ہے فاطمہ! اِس بار میں کچھ بھی گنوانا نہیں چاہتا۔''اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُسکے آنسو صاف کیے۔

''وہ مجھے مارتا تھا، بیلٹ سے۔۔۔''اُس نے علی کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا تو اُس نے ضبط سے آنکھیں میچیں۔ پر اُسے کہنے دیا، کہ وہی اُسکا غمگسار تھا، اُسکا لباس تھا۔ علی نے اُسکا ہاتھ تھام لیا۔

''وہ میرا ہاتھ جلا دیتا تھا، میرا کھانا بند کر دیتا تھا، مجھے گالیاں دیتا تھا۔ اور تب مجھے تم یاد آتے تھے۔۔۔'' وہ کہہ رہی تھی، اور علی سن رہا تھا۔ وہ اُسے بولنے دے رہا تھا۔ اُسے بول لینا چاہیے، بول کر دل ہلکا کر لینا چاہیے۔ تاکہ اب ماضی کا کوئی پچھتاوا دل میں نہ رہے۔

--------+---------+----------

کیسی ہو؟'' ابھی وہ مارٹ سے کچھ ضرورت کا سامان لے کر، گھر کے دروازے پر پہنچی ہی تھی کہ برابر سے رضا آتا دکھائی دیا۔ جینز پر پوری آستینوں والی پولو ٹی شرٹ پہنے، وہ عام سے حلیے میں تھا۔

''پہلے جیسی!'' اُس نے ایک لفظی جواب دیا۔ آج موسم اچھا تھا، اندر بھی اور باہر بھی۔ لہٰذا وہ بھی چہک رہی تھی۔

''پر میں تو پہلے جیسا نہیں رہا۔'' اُس نے جیبوں میں ہاتھ ڈالتے بیچارگی سے کہا۔ ہلکی ہلکی پھوار جاری تھی۔

''میں نے کب پوچھا؟'' لٹھ مار انداز میں کہتے کندھا اچکایا۔

''پر میں نے سوچا کہ بتا دوں۔'' اُس نے بڑی معصوم شکل بنا کر کہا۔

''میں آج پناہ گاہ نہیں آسکوں گی۔ آج گھر میں ولید کی واپسی کی خوشی میں دعوت ہے۔'' اُس نے بتایا۔

''واقعی؟ کیسا ہے ولید؟'' وہ خوش ہوا۔ ولید کو اُسکا خاندان مل گیا اور کیا چاہیے تھا؟

''بہت اچھا ہے۔ اور مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ میرے اتنے قریب تھا۔ اور مجھ سے اتنا مانوس بھی!'' وہ کہنے لگی، سیاہ آنکھوں میں نمی در آئی۔

''یہ سب ایسے ہی لکھا تھا۔'' اُس نے کہا۔

''پتہ ہے کل پہلی بار نوید بھائی بہت خوش تھے۔ تمہارا ذکر بار بار کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ۔۔۔'' وہ رکی۔

''کہ؟'' وہ سیدھا ہوا۔۔۔ متجسس بھی۔

''کہ رضا نے میری ذات پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ بدلے میں جو مانگ لے، بنا ماتھے پر شکن لائے دے دوں گا۔'' جزا نے خوشی خوشی بتایا۔

''پر میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔اور نہ مجھے کسی بدلے کی چاہ ہے۔''اس بات پر جزا کی مسکراہٹ سمٹی۔ کبھی جو کوئی بات سمجھ جائے یہ خود سے۔۔۔

''ایسے موقع بار بار نہیں آتے۔''اُس نے جتانا چاہا۔۔ سمجھانا چاہا۔۔۔

''مجھے نہیں چاہیے کچھ بھی، بلکہ تمہارا شکریہ کہ تم نے میرے پیچھے پناہ گاہ کا اتنا خیال رکھا۔''اُس نے مسکراہٹ ضبط کرتے ایسے کہا جیسے وہ واقعی عقل سے پیدل ہو۔

''احسان نہیں کیا میں نے۔۔۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا اور دروازہ کھولنے لگی۔

''سنو!'' سینے پر ہاتھ باندھے کھڑے اُس سانولی رنگت والے پرکشش مرد نے پکارا۔

''کیا ہے؟'' سیاہ آنکھوں پر سیاہ کاجل لگائے، سانولی لڑکی نے ناراضگی سے دیکھا۔

''تمہیں کسی احسان کے بدلے میں تھوڑی مانگنا ہے۔ تمہیں تو پوری عزت واحترام کے ساتھ، دامن پھیلا کر مانگنا ہے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔قریب کوئی گاڑی آرہی تھی شاید!

''میں نے ایسا کب کہا؟''اُس نے یہاں وہاں دیکھا۔یہ پروپوز کرنے کا کونسا طریقہ تھا؟

''پر میں نے تو یہی کہنا تھا۔'' وہ مسکرایا۔گاڑی رکی، دروازہ کھلا اور نوید اُترا۔

''بھائی!'' جزا اُسے دیکھ کر حیران ہوئی، اور رضا پتھر۔۔۔

''تم باہر کیا کر رہی ہو؟''بشریٰ کی طرف کا دروازہ کھولتے اُسکے لہجے میں حیرت تھی۔ کسی فوجی کی طرح اکڑ کر کھڑے رضا نے زحمت بھی نہ کی دیکھنے کی۔ یہ ایس ایس پی صاحب ہمیشہ غلط وقت پر انٹری کیوں دیتے تھے؟

''میں دعوت کی تیاری کے لیے کچھ سامان لینے گئی تھی، امی کو ضرورت تھی۔''اُس نے کہا۔

''ارے تو نوید کو کہہ دیتی۔''ولید کو گود میں لیے بشریٰ نے گاڑی سے اترتے کہا۔رضا کو سامنے دیکھ کر ولید اُسکی گود میں مچلنے لگا تھا۔

نوید قریب آیا اور رضا کو دیکھا، اور رضا نے اُسے۔۔۔

''کیسے ہو؟'' رضا نے فوراً مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ اُس نے ہاتھ ملایا اور ذرا بھنویں اچکا کر اُسے دیکھا۔

''میں نے مس جزا کو دیکھا تو سوچا پوچھ لوں کہ آج یہ پناہ گاہ کیوں نہیں آئیں؟'' زندگی میں دوسری بار اُس نے بنا پوچھے وضاحت دی تھی۔ پہلی بار بھی اسی شخص کو دی تھی۔

''تو؟'' ایس ایس پی صاحب کو نہ کل کوئی فرق پڑا تھا اور نہ آج۔ جزا نے اُسکی حالت سے حظ اٹھاتے مسکراہٹ دبائی۔ اور اِس سے قبل وہ کہ اِس تو کا جواب تلاشتا، بشریٰ نے ولید کو گود سے اُتارا اور وہ بھاگتا ہوا رضا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اُس نے جھک کر اُسے گود میں اٹھایا اور گلے سے لگا لیا۔

''میرے جگر کے ٹوٹے۔۔۔ کیسے ہو؟'' اُس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ بڑے اچھے وقت پر جان بچائی تھی اُس نے۔

''آپکو پتہ ہے میں نے کل ریموٹ والی کار لی ہے۔'' اُس نے رضا کو بتایا۔

''اوہ! کس نے دلائی؟'' اُس نے جان کر پوچھا۔

''اُنہوں نے۔۔'' اُس نے نوید کی جانب اشارہ کیا جو پیار سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''وہ آپکے بابا ہیں۔ اُنہیں بابا کہو۔'' اُس نے کہا۔ نوید اُسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

''بابا!'' اس نے فوراً مان لیا۔

''بابا!۔۔۔ بابا!'' اُسکی گود میں ٹیڑھے میڑھے ہو کر پلٹ کر نوید کو دیکھتا وہ ہنس ہنس کر اُسے بابا کہہ رہا تھا، جبکہ نوید اُسے نہال ہوتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اُنکو؟'' بشریٰ کی جانب اشارہ کر کے پوچھا کہ اُسے کیا کہوں۔

''مما کہو!'' رضا نے کہا تو وہ اب بشریٰ کو مما مما پکارنے لگا۔

''اور مجھے پھوپھو کہو!'' جزا نے آگے ہو کر پُر جوش ہوتے کہا۔

''نہیں!'' ولید نے یک لفظی جواب دے کر منہ پھیر لیا تو نوید بے ساختہ ہنسا تھا، جبکہ جزا منہ بسورنے لگی تھی۔ رضا نے فلحال خود کو ہنسنے سے باز ہی رکھا کیونکہ دونوں ہی بہن بھائیوں کے مزاج کا کوئی بھروسہ نہ تھا۔

''کیا کیا آپ نے کل؟'' رضا، ولید سے بات کرنے میں محو تھا، وہ بھی اُسے نجانے کون کون سی کہانیاں سنانے لگا تھا۔

''کیا میں پناہ گاہ آسکتی ہوں؟'' کانوں میں بشریٰ کی آواز پڑی تو اُس نے رک کر دیکھا۔ نوید نے بھی حیرت سے اُسے دیکھا۔

''میں عائشہ جی سے، ولید کے دوستوں سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اُس نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

''ہاں کیوں نہیں؟ ولید کا گھر آپکا بھی گھر ہے۔'' رضا نے خوش دلی سے کہتے دروازہ وا کیا اور اُنہیں اندر آنے کی دعوت دی۔ جبکہ نوید کی افسردہ نظریں ابھی بھی بشریٰ پر ہی تھیں۔ وہ جانتا تھا وہ کیا دیکھنا چاہتی تھی؟ وہ اُس جگہ کو دیکھنا چاہتی تھی، جہاں ولید بڑا ہوا تھا، جہاں اُس نے پہلی بار اپنے قدم اٹھانا سیکھے تھے، جہاں اُس نے بولنا سیکھا تھا، وہ اُسکا گزرا وقت محسوس کرنا چاہتی تھی۔

''آجائیں اندر!'' رضا نے اُنہیں اندر آنے کو کہا تو وہ آگے بڑھی، ولید رضا کی گود سے اُتر کر اندر بھاگ چکا تھا۔ نوید بھی اُسکے پیچھے آیا اور جزا بھی۔۔۔

''تمہیں تو امی کو سامان نہیں دینا؟'' نوید نے رک کر اُسے دیکھا۔

''دے دونگی، پر پہلے مجھے بھی عائشہ جی سے ایک کام ہے۔'' وہ جلدی سے کہتی اُسکے برابر سے ہوتی اندر چلی گئی، آیا کہیں گھر واپس ہی نہ بھیج دے۔ رضا اُنہیں لیے اندر آ گیا۔ آنے والوں کو دیکھ کر عائشہ جی کھڑی ہوئیں۔

''عائشہ جی! یہ ولید کے والدین ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اُس نے اُنہیں اُنکا تعارف کروایا۔ بشریٰ تو اُنکے گلے لگ گئی۔ پھر وہ اُنہیں پناہ گاہ دکھانے لگا، ایک ایک بچے سے ملوانے لگا۔ جہاں ولید رہتا تھا، اُسکا کمرہ، اُسکا بستر، اُسکے کپڑے، کھلونے ایک ایک شے بشریٰ چھو چھو کر دیکھتی، محسوس کرتی رہی۔

''مما! یہ میرا نمبر بلاکس۔۔۔'' ولید اپنے نمبر بلاکس اُٹھا کر بشریٰ کو دکھانے لایا۔ اور وہ لفظ **مما** کی چاشنی میں کھونے لگی۔

''آؤ! تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں۔'' رضا نے نوید سے کہتے ہوئے ایک بورڈ گیم سامنے کھولا اور اُسے چھوٹی میز پر رکھا۔ پھر ولید کو قریب بلایا، جزا کے پاس کوئی میسج آیا تو وہ غیر محسوس انداز میں وہاں سے باہر نکل گئی۔

''ولید! یہ گن کر بتاؤ کہ بورڈ پر کتنے اسکوائرز (چکور خانے) ہیں۔'' اُس نے ولید سے کہا تو نوید کے ساتھ ساتھ سب کو اُمید تھی کہ وہ باقی بچوں کی طرح سارے خانوں کی گنتی کر کے نتیجہ بتائے گا۔ لیکن۔۔۔

''ون، ٹو، تھری، فور، فائیو۔۔۔'' اُس نے پہلی رو کے تمام خانے گنے۔ پھر پہلے کالم کے دس خانے۔ ''فائیو ٹائم ٹین از ایکوال ٹو ففٹی۔۔ٹوٹل ففٹی اسکوائرز۔۔۔ (پانچ مرتبہ دس، پچاس ہوتے ہیں۔ یعنی کل پچاس خانے۔۔۔)'' اُس نے چند سیکنڈز میں جواب دیا تو لمحوں کو سب حیران رہ گئے۔ جبکہ رضا مسکرا رہا تھا۔

''اچھا فائیو ٹائمز فائیو (پانچ مرتبہ پانچ) کتنے ہوتے ہیں؟'' رضا نے پوچھا۔

''ٹوئنٹی فائیو۔۔۔'' اُس نے ایسے جواب دیا جیسے اُسکے لیے کوئی گیم ہو۔

''اور نائن ٹائمز نائن؟''

''ایٹی ون!''

''گڈ!'' اُس نے ولید کا سر سہلاتے شاباشی دی۔

''یہ سب اس نے یاد کیا؟'' بشریٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں! اسے میتھس پسند ہے۔ یہ چیزوں کی گنتی کرتا ہے۔ اِسکے پاس نمبر بلاکس ہیں، وہ بلاکس کو جوڑ کر اندازہ لگاتا ہے کہ کتنے بلاکس کتنی جگہ جوڑنے سے کل تعداد کیا ہوگی؟ یہ موبائل میں بھی نمبر گیمز کھیلتا ہے، اور کارٹون میں بھی نمبر بلاکس ہی دیکھتا ہے۔ اسے بس یہی پسند ہے۔'' رضا نے بتایا۔

''میں تو اتنا ذہین نہیں تھا۔ یہ کس پر چلا گیا؟'' نوید نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ظاہر ہے، اپنے تایا پہ۔۔'' اِس آواز پر سب نے پلٹ کر دیکھا تو جزا کے ساتھ وحید کھڑا تھا، پیچھے اُسکی بیوی بھی تھی۔

''معاف کرنا تمہاری اجازت کے بنا آگیا۔'' وحید نے رضا کو دیکھ کہا تو وہ مسکرایا۔

''کوئی بات نہیں!'' بچے اشتیاق سے اتنے سارے نئے چہروں کو دیکھ رہے تھے۔

''ذہین تو رضا بھی بہت ہے، میں نے تو اکاؤنٹس اور فائنانس سے تنگ آکر ایم بی اے نہیں کیا، جبکہ یہ تو پوزیشن ہولڈر تھا۔'' نوید نے رضا کی طرف دیکھتے ہوئے اُنہیں بتایا۔

''یہ کیا انگلش بھی شوق سے پڑھتا ہے؟'' بشریٰ نے پاس رکھی انگریزی حروف کی کتاب ہاتھ میں لیتے پوچھا۔

''کوشش کر کے تھک چکے ہیں پر اسے انگلش کے الفابیٹس (حروف) کبھی یاد نہیں ہوئے، نہ اسے اُنکی پہچان ہوئی کبھی۔ شاید اِسکی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم نے بھی چھوڑ دیا کہ وقت کے ساتھ سیکھ جائیگا۔'' رضا نے بتایا۔

''حالانکہ اِسکے باپ نے انگریزی میں ماسٹرز کر رکھا ہے۔'' وحید نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اگر مجھے اچھے سے پڑھا لیتے تو میں بھی میتھس اچھے سے پڑھتا۔'' نوید نے بھائی پر چوٹ کی تو وہ ہنسا۔

''میں نے تو اسے پہلی بار بولتے ہوئے، چلتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔'' بشریٰ نے جانے کس احساس کے تحت افسردگی سے کہا تھا۔ نوید کا چہرہ یکدم دکھ سے بھر گیا، پر اُس نے کچھ نہ کہا۔ البتہ رضا کے ذہن میں کوئی خیال ضرور کوندا تھا، پر فلوقت وہ خاموش رہا۔

''ہمارے گھر دعوت ہے، آپ سب بھی آئیں نا!'' ملائکہ (وحید کی بیوی) نے کھڑے کھڑے سب کو دعوت دی۔

''بہت شکریہ! لیکن آج مجھے کچھ کام ہے۔'' اُس نے کہا۔

''ارے تو کوئی بات نہیں! ہم تمہارے لیے الگ سے ڈنر رکھ لیں گے۔'' وحید نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے کہا۔

''اِسکی کیا ضرورت ہے؟''

''بھئی ایک ڈنر تو تمہارے ساتھ بنتا ہے۔'' وحید نے کہا۔ وہ سب رضا کے ساتھ اس طرح سلوک کر رہے تھے جیسے وہ انہی کے خاندان کا حصہ ہو۔ انکا دوستانہ رویہ اُسے اچھا لگا۔

''دعوت ٹھکراتے نہیں ہیں۔'' جزا نے پہلی بار کہا تو وہ چونکا۔

''چلیں! پھر جب آپ بلائیں میں پوری کوشش کروں گا۔'' وہ راضی ہو گیا تو نوید نے بھنویں اچکا کر اُسے دیکھا۔ ابھی تو نہیں مان رہا تھا یہ؟

عائشہ جی چائے کے ساتھ لوازمات لے آئیں تو سب نے بیٹھ کر خوشگوار ماحول میں چائے پی، بچوں سے ملاقات کی۔ وحید نے تو رضا کا باقاعدہ انٹرویو ہی لے لیا۔ نجانے کیوں؟

جبکہ نوید خصوصاً جزا کے برابر میں ایسے ٹک کر بیٹھ گیا کہ اُس پر نظر ہی نہ پڑے۔ واپسی پر وہ اُنہیں دروازے تک چھوڑنے آیا۔

''آپکا ایک بار پھر بہت شکریہ!'' بشریٰ نے جاتے ہوئے اظہار تشکر مناسب سمجھا۔ ولید کا سامان، عائشہ جی نے، اُسے پیک کر کے دے دیا تھا۔

''شکریہ کہہ کر میرے خلوص کو شرمندہ نہ کریں بھابھی!'' اُس نے بھابھی کہا تو نوید نے ذرا چونک کر دیکھا، اُسے اچھا لگا تھا۔ وہ مسکرائی، پھر سب نے واپسی کی راہ لی، وحید نے اُس سے اچھے سے مصافحہ کیا، پھر جب سب ہی چلے گئے تو صرف وہ اور نوید وہاں رہ گئے۔

''تم ہسپتال گئے تھے آج؟'' نوید نے اُس سے پوچھا۔

''ابھی تک نہیں گیا، رات کو علی کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا۔ مقدّم گیا تھا تو اُس سے بات ہوئی تھی۔'' اُس نے عام سے انداز میں بتایا۔

''علی کے ساتھ؟'' اُس نے بھنویں اُچکا کر اُسے دیکھا۔ واقعی؟ تم نے علی کہا؟

''کیوں؟ میں اُسکے ساتھ نہیں جاسکتا؟'' اُس نے اُس سے بھی زیادہ حیرت سے پوچھا، تو اُس نے سر جھٹکا۔ اور سامنے دیکھنے لگا۔

''اظہر کی کیا خبر ہے؟'' رضا نے بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔

''کیس چل رہا ہے عدالت میں، میڈیا پر بھی کافی شور مچا ہوا ہے۔ پیر پریشر بھی بہت ہے۔ لیکن دیکھتے ہیں کہ ججز اتنا پریشر برداشت کر سکتے ہیں یا نہیں؟'' اُس نے تفصیل سے بتایا۔ رضا اُسے بغور دیکھ رہا تھا، یہ آدمی فقط اپنی بیوی کی موجودگی میں ہی مسکراتا تھا کیا؟

''چلو! اللہ بہتر کرے۔ مجھے خوشی ہے کہ چیزوں کا انجام خوشگوار انداز میں ہوا ہے۔'' اُس نے کہا تو نوید سر ہلاتے ایک قدم آگے بڑھا، پھر رکا اور اُسے دیکھا۔

''مجھے ایک بات یاد آئی۔''

''کیا؟''رضا نے کچھ حیرت سے دیکھا،اُسکے سنجیدہ چہرے پر یکلخت ہی دوستانہ سا تاثر اُبھرا۔

''تم نے کہا تھا بھائیوں میں کوئی قرض نہیں ہوتا۔''

''ہاں!''وہ مسکرایا۔

''تو۔۔''وہ رکا، پھر آگے آیا اور اُسے گلے لگالیا۔

نوید عالم کی جانب سے پہلی پیش قدمی۔۔۔

پہلا اظہار۔۔۔

واپسی کی منزل پر پہلا قدم۔۔۔

''بھائی کو گلے تو لگا سکتے ہیں نا؟''اُس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔رضا کچھ بھی نہ کہہ سکا،بس ذرا سی نم آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔

''تم نے جو میرے لیے کیا ہے، بدلے میں تم جان مانگو تو میں وہ بھی دینے کو تیار ہوں۔''اُس نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے کہا۔

''نہیں! تمہاری جان لیکر میں کیا کروں گا؟''اُس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو نوید ہنسا۔

''لیکن تم یہ بار بار احسان اور شکریے کا راگ الاپنا بند کرو ورنہ میں دوبارہ دوستی ختم کر سکتا ہوں۔''رضا نے ذرا دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''دوستی ہوئی کب تھی؟''اُس نے ایسے پوچھا جیسے بڑی کوئی حیران کن بات کی ہو رضا نے۔جبکہ اُس نے پہلے چند منٹ گھورا، پھر دونوں ہنس دیئے۔

کچھ دیر بعد وہ اندر آیا تو دروازے پر کھڑی جزا کا منہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔

''تم کیا کر رہی تھی یہاں؟''نوید نے ذرا حیرت سے آنکھیں وا کرتے اُسے دیکھا۔

''وہ میں آپکو بلانے آئی تھی۔''اُس نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔

''ہاں! میں ذرا رضا سے کچھ بات کر رہا تھا، اس لیے رک گیا تھا۔''اُس نے موبائل میں آئے میسج کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ آپ رضا کو گلے کیوں لگا رہے تھے؟''اُس نے پوچھ تو لیا، پر نوید کو موبائل سے نظریں اُٹھا کر خود کو سنجیدگی سے گھورتا پایا، تو زبان دانتوں تلے دبائی۔

''وہ۔۔۔میرا مطلب۔۔۔''

''رضا کتنا بڑا ہے تم سے؟''اُس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''جی؟''وہ حیران ہوئی، سوال کا مقصد سمجھ نہیں آیا۔

''جتنا میں بڑا ہوں، اتنا ہی وہ بھی بڑا ہے تم سے۔''

''تو؟''وہ اب بھی نہ سمجھی۔

''بھائی بولا کرو اُسے۔۔۔''وہ اُسے ہکا بکا چھوڑ کر یہ جا وہ جا ہو گیا۔ جبکہ لان میں کھڑی بشریٰ کا چہرہ ہنسی ضبط کرنے کے چکر میں سرخ ہو گیا تھا۔

''بھائی بولا کرو۔۔۔ ہونہہ!''اُس نے تپ کر نوید کی نقل اتاری تو اب کہ بشریٰ نے اپنی ہنسی نہیں روکی تھی۔

--------+---------+----------

''کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اگر میری اظہر سے شادی ہو جاتی تو؟''رات وارڈ میں حور عین نے اُسے سوپ پلاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تو کیا؟ پھر میں آج ہسپتال میں نہ ہوتا۔''اُس نے حور کو دیکھتے مزے سے کہا۔

''کیوں؟ اظہر تو تب بھی مجرم ہوتا۔''اُس نے گھورا۔

''کیونکہ تم میرے اوپر گولی نہیں چلاتی۔ وہ ایمان تھی، اُسکے لیے میں پہلے بھی اظہر سے کم تر تھا۔ آج بھی ہوں۔''اُس نے دکھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''چلو! تم یہ تو جان گئے کہ میرے لیے تم کتنی اہمیت رکھتے ہوئے؟''اُس نے اُسکا دکھ کم کرنے کے لیے بات بدلی۔

''یہ تو میں ہمیشہ سے جانتا ہوں۔مجھے جب گولی لگی تو آخری چہرہ بھی تمہارا تھا۔آخری خیال بھی تمہارا آیا کہ اگر میں مر گیا تم برداشت نہیں کر سکو گی۔''اُس نے کہا تو حورعین کی آنکھوں میں یکدم ہی آنسو جمع ہونے لگے۔

''یہ مرنے ورنے کی باتیں نہ کرو میرے سامنے!''اُس نے آنسو صاف کرتے خفگی سے کہا۔

''میں نے تو وہ بتایا جو محسوس کیا۔ویسے مجھے نہیں پتہ تھا تم روتے ہوئے بھی اتنی اچھی لگتی ہو۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو حورعین نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

''گولی تمہارے سر پر تو نہیں لگی تھی، پھر ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟''اِس جواب پر حسین قہقہ لگا کر ہنسا، ہنسا تو کھانسی آگئی، کھانسا تو ٹانکوں میں درد اٹھا۔

''آہ!''وہ کراہ کر رہ گیا۔

''کس نے کہا ہے فضول میں ہنسنے کو؟''حور نے ڈپٹا۔

''تو کس نے کہا ہے جوک مارنے کو؟''اُس نے گھورا۔

''پاگل ہو تم!''اُس نے کہا۔

----------+---------+--------

**ایک ماہ بعد:**

حسین اور عمر کو آج ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔چاروں اُن سے ملنے آئے تھے۔ایمان کی ضمانت ہو چکی تھی پر وہ کسی طور حسین سے بات کرنے اور اِس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھی کہ اظہر مجرم ہے۔حسین نے بھی اُسے اُسکے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

''تم اچھے بھلے ہو، زبردستی اپنے پورے وجود کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال رکھا ہے۔''اُسے پارکنگ تک لاتے مقدّم نے کہا تھا۔حالانکہ اُسے وہیل چیئر پر آنا چاہیے تھا۔پر وہ چلنا چاہتا تھا۔دوسرے لفظوں میں مقدّم سے خدمت کروانا چاہتا تھا۔

''ذرا سا سہارا کیا دے دیا، احسان جتانے لگ گئے؟'' حسین نے ذرا مزید بوجھ اُسکے کندھوں پر منتقل کیا تو اُس نے گھورا۔

''اگلے مہینے سے پہلے چلنے کے قابل ہو جاؤ ورنہ شادی میں ایسے ہی آنا۔ لنگڑاتے ہوئے۔'' مقدّم نے کہا۔

''تم شادی آگے بڑھاؤ! میں ایسے نہیں آوں گا۔''

''شادی اپنی تاریخ پر ہی ہو گی، تمہارے تو اچھے بھی آئیں گے۔'' اُس نے حسین کو سہارا دے کر کھڑا کیا تو علی بھی گاڑی لے کر پہنچ گیا۔ عمر کو رضا وہیل چیئر پر لے کر آیا تھا۔ نوید بھی وہیں تھا۔ پہلے سے خوش، پہلے سے مطمئن۔۔۔

''تم کہاں تھے اتنی دیر سے؟'' مقدّم نے علی سے پوچھا۔

''پارکنگ سے گاڑی نکالنے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا۔'' عمر کو وہی لے کر جانے والا تھا۔ جبکہ حسین کے لیے اُسکے گھر والے آئے تھے۔

''تم نے خواہ مخواہ زحمت کی۔'' عمر نے علی کو دیکھتے کہا۔

''ٹھیک ہے تم خود چلے جاؤ!'' مقدّم کا ایک ہی کام تھا، دوسروں کے معاملے میں ٹانگ اڑانا۔

''تم اپنی زبان کے جوہر کم دکھاؤ پلیز!'' رضا نے درخواست کی۔

''تم دونوں گھر جا کر آرام کرو، جلدی ٹھیک ہو۔ بہت کام ہیں کرنے کے لیے۔'' مقدّم کو پہلے کب فرق پڑا تھا؟

''تم اپنی شادی میں اِن دونوں سے کام کرواؤ گے؟'' علی کو یقین نہ آیا۔

''تم سے بھی!'' وہ بھی ڈھیٹ تھا۔

''ایس ایس پی صاحب سے پنکھے صاف کروالینا۔'' حسین نے مفت مشورہ دیا تھا۔

''میرے خیال سے تمہیں اب گاڑی میں بیٹھ جانا چاہیے۔'' نوید نے آگے بڑھ کر اُسے دوسری جانب سے سہارا دیا تا کہ اُسے، اُسکے بھائی کی گاڑی تک لے جا سکے، اور تا کہ اُسکا منہ مزید چلنے سے روکا جا سکے۔

''تم لوگ گاڑی میں بیٹھنے میں عمر کی مدد کرو۔'' نوید نے علی کو کھڑے دیکھ کر کہا۔

''کرتا ہوں، لیکن پہلے میں رضا کے اعلیٰ ظرف ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔''علی کی بے سر و پا بات کسی کو سمجھ آئی نہ آئی، پر عمر کی وہیل چیئر پر غور و خوص کرتے رضا نے سر اٹھا کر اچھنبے سے اُسے دیکھا۔

''تم مجھے پیشگی معافی دے چکے تھے۔''اُس نے فوراً کہا۔

''میں نے تمہاری اعلیٰ ظرفی تک معافی واپس لے لی تھی۔''اُس نے جتایا۔

''میں ہر گز معافی نہیں مانگنے والا۔''اُس نے کہا۔

''میں روزِ محشر دیکھوں گا۔''اِس بات پر رضا نے دانت کچکچائے۔

''چلو! چلو! معافی مانگ کر اپنا اعمال نامہ صاف کرو جلدی! پھر مجھے گھر بھی جانا ہے، کام ہیں بہت کرنے کو۔''مقدم کی شادی نہیں ہو رہی تھی جیسے کوئی آفت آ رہی تھی، اُسکے کام کے رونے ہی نہیں ختم ہو رہے تھے۔

''شرم کرو! دوسروں کے گناہ نہیں گنتے۔''حسین نے اُسے شرم دلانی چاہی۔ جبکہ رضا منہ بناتے عمر کی وہیل چیئر کے پیچھے سے باہر آیا۔

''معافی ہی مانگنا۔''حسین نے لقمہ دیا تو سب ہنسے۔

''وہ۔۔۔اصل میں۔۔۔''رضا نے کان کھجائے۔ معافی مانگنا آسان کام تھوڑی تھا؟

''ہاں ہاں بولو! میں سن رہا ہوں۔''وہ بھی ہمہ تن گوش تھا۔

''بات کچھ یوں ہے کہ۔۔۔۔''یہاں وہاں دیکھا، سب کے مسکراتے چہرے منہ چڑاتے لگے۔

''جلدی ختم کرو بھئی۔۔۔''مقدّم کو نجانے کس بات کی جلدی تھی؟ سب نے اُسے گھورا۔ جبکہ علی منتظر۔۔۔۔

''آدمی تم اچھے ہو، پر تھوڑے گدھے ہو۔''یہ معافی تھی؟ علی کا چہرہ حسبِ توقع، حسبِ امید، حسبِ تصور تپا۔ باقی سب ایک مرتبہ پھر ہنسے تھے۔

''بھاڑ میں جاؤ!''رضا کا تکیہ کلام اُسی کے منہ پر مارتے وہ عمر کی طرف بڑھا۔ جب رضا نے بازو پکڑ کر اُسے روکا،

پھر دیکھتی آنکھوں نے دیکھا۔۔۔۔

سنتے کانوں نے سنا۔۔۔۔

رضاالٰہی نے علی سفیر کو گلے لگالیا۔اُس نے مسکراتے ہوئے،پورے دل سے اُسکے گرد بازو تنگ کر لیا۔

معافی کی ضرورت کسے تھی بھلا؟

مسکراہٹ نے سب کے چہروں کا احاطہ کر لیا تھا۔۔۔

دوستی فضامیں رچ بس گئی تھی۔۔۔

ضروری نہیں کہ ہمیشہ پرانی باتیں دہرائی جائیں۔۔۔

شکوے شکایتیں کی جائیں۔۔۔

''شکر! معاملہ رفع دفع ہوا۔'' مقدّم نے تو باقاعدہ سکھ کا سانس لیا تھا۔

''اب تمہاری شادی سکون سے ہو جائے گی؟'' یہ پہلی جگت۔۔بالکل پہلی جگت ایس ایس پی صاحب کی جانب سے۔۔۔

''چلو! چلو! اسے گاڑی میں بٹھاؤ بھی!'' مقدّم نے کمال بے نیازی سے نظرانداز کرتے اُن دونوں کو کہا جو الگ ہو چکے تھے،پر چہرے سے خوش تھے۔

بالآخر۔۔۔

معاملہ تمام ہوا۔۔۔

----------+---------+--------

حسین گھر جاچکا تھا، عمر کو بھی علی نے اُسکے گھر چھوڑ دیا تھا۔ واپسی پر نوید کو اپنی والدہ کی طرف جانا تھا تو رضا نے اُسے ساتھ چلنے کی پیشکش کر دی جو اُس نے بخوشی قبول کر لی۔ ویسے بھی، آج کل وہ بلاوجہ ہی مسکراتا تھا۔ تو اُس سے ڈر بھی ذرا کم لگتا تھا۔ راستے بھر نوید کسی وجہ سے فون کال میں مصروف رہا۔ جبکہ دوسری جانب رضا بھی وہی کام کر رہا تھا۔ لیکن غیر محسوس انداز میں۔۔۔

''میں کہہ رہا ہوں یہ اچھا وقت ہے، بول دو اُسے۔ آج کل موڈ بھی اچھا ہے، ایسا نہ ہو بعد میں زبان کاٹ کر کوؤں کو کھلا دے۔'' دائیں کان میں لگے ہیڈ فون میں حسین کی آواز آئی، جو اپنے گھر پہنچ چکا تھا اور اب اُسکا دماغ چاٹ رہا تھا۔

''تم میرا حوصلہ بڑھا رہے ہو یا ڈرا رہے ہو؟'' اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ نوید بے حد مصروف تھا، دھیان اِس طرف نہ تھا۔

''دیکھو! میں تو سچ بات کہہ رہا ہوں۔ تم مجھے فون پر ہی رکھنا، تاکہ میں تمہیں موقع کے حساب سے مشورہ دے سکوں۔'' حسین نے کہا۔ پناہ گاہ کے سامنے اُس نے گاڑی روکی اور نوید کو دیکھا۔ اُس نے انگلی سے دو منٹ کا اشارہ کیا تو رضا نے زبردستی مسکرا کر سر ہلایا۔

''میں اب بھی کہہ رہا ہوں، احتیاطاً گاڑی کا دروازہ کھلا رکھو۔ جان بچا کر بھاگنے میں آسانی ہو گی۔'' حسین وہاں اُسکا خون خشک کرنے ہی بیٹھا تھا۔ نوید کی بات ختم ہوئی تو اُس نے فون کاٹا اور اُسکی جانب دیکھا۔

''تھنک یو رضا! اور سوری تمہیں اتنی دیر انتظار کروایا۔'' نوید نے اپنی جانب کا دروازہ کھولتے کہا۔

''ایک منٹ!'' رضا نے فوراً کہا تو وہ رکا اور حیرت سے اُسے دیکھا۔

''کیا ہوا؟''

''تم سے بات کرنی تھی۔'' رضا نے ہچکچاتے۔۔۔ گھبراتے۔۔۔ تو تلاتے کہا۔

''ہاں! کہو۔'' وہ دروازہ بند کر کے مکمل اُسکی جانب متوجہ ہو گیا۔ یقیناً کوئی اہم بات ہو گی جب ہی روکا ہو گا۔

''ڈرنا بالکل مت! سنجیدگی کے ساتھ، مکمل بردباری سے بات کرنا۔'' حسین کا مفت مشورہ!

''تمہاری، میرے بارے میں کیا رائے ہے؟'' اُسے پوچھنا کچھ تھا، پوچھ کچھ بیٹھا۔

''گدھے انسان! یہ سوال بعد میں کرنے کا تھا۔'' رضا کے کانوں میں آواز اُبھری۔ جبکہ نوید نے ذرا مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

''کیا تم کسی سے بات کر رہے ہو؟'' نوید نے پوچھا۔

''نہیں! نہیں! میں کسی سے کیوں بات کروں گا؟'' رضا نے کال کاٹتے ہوئے ہیڈ فون کان سے اتارے، دوسری طرف حسین ارے، ارے ہی کرتا رہ گیا تھا۔ اُس سے مشورے لینے سے اچھا تو خود ہی بات کر لیتا وہ۔

''تو میں یہ پوچھ رہا تھا، کہ تمہاری میرے بارے میں کیا رائے ہے؟'' اُس نے دوبارہ سوال دہرایا۔

''یہ کیسا سوال ہے؟ میری تمہارے بارے میں اچھی رائے ہی ہو گی۔ تم دوست ہو میرے!'' نوید انجان تھا؟ یا جان کر انجان؟ اُسکے دوست کہنے پر رضا کے حوصلے بڑھے۔

''ہاں! وہی میں کہہ رہا تھا کہ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ایک اچھا آدمی ہوں۔ اور میری زندگی کا ایک اچھا خاصا حصّہ تمہارے سامنے ہی گزرا ہے تو۔۔۔'' وہ رکا، ہمت جواب دینے لگی۔ جبکہ نوید کہنی ڈیش بورڈ پر ٹکائے، چہرہ ہاتھوں کی مٹھی پر رکھے اُسے ہی دیکھ رہا، بلکہ گھور رہا تھا۔

''تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں ایسا ویسا انسان بالکل نہیں ہوں اور میرا زندگی میں کبھی کسی کے ساتھ۔۔۔''

''ایسا ویسا؟'' نوید کو ایسا ویسا پر اعتراض تھا شاید!

''ایسا ویسا یعنی۔۔۔'' اُس نے پھر کان کھجائے۔ ''یعنی میں کبھی کسی غلط کام میں ملوث نہیں رہا۔ تم تو جانتے ہی ہو مجھے۔۔۔'' اُس نے تھوک نگلا۔ آخر اِس سے آگے بولا کیوں نہیں جا رہا؟

''تو؟'' نوید نے گہری سانس لیتے سینے پر بازو لپیٹے۔ رضا نے اُسکے ماتھے پر پڑتے بلوں کو گنا اور غیر محسوس انداز میں دروازے کے لاک پر ہاتھ رکھ لیا۔ احتیاطاً!

''تو یہ کہ میں آج کل شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ بات ایسے شروع کی جا سکتی ہے۔

''اچھی بات ہے، میری کوئی ضرورت ہے تو ضرور بتانا۔'' اُس نے گھورنا جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! وہی تو۔۔۔ تم نے کہا تھا کہ میں جو مانگو تم دینے کو تیار ہو۔'' اُس نے دل کڑا کر کے کہا۔ اِس سے آسان تو لڑکی راضی کرنا ہوتا ہے۔ یہ زیادہ مشکل تھا۔

''کہا تھا، تو؟''ایس ایس پی صاحب کا ضبط کسی بھی لمحے جواب دے سکتا تھا۔

''تو۔۔۔''اب سیدھے سیدھے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ تمہاری بہن کا ہاتھ چاہیے۔

''تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ کون مجھے اپنی بیٹی دے گا؟''پہلی بار۔۔۔ بالکل پہلی بار رضا کی زبان سے بے ساختہ نکلا تھا۔یکلخت ہی اُسکے اپنے ہاتھ لاک پر ڈھیلے پڑے۔یہ تو اُس نے سوچا ہی نہ تھا۔نوید کے ماتھے کے بل گم ہوئے، چہرے پر نرمی در آئی۔

''کیوں؟ابھی تو تم نے کہا کہ تم اچھے آدمی ہو؟''اُس نے طنز نہیں کیا تھا۔اُس نے اُسے بتایا تھا، احساس دلایا تھا۔

''ہاں! پر اچھا ہونا کافی نہیں ہے۔خاندان ہونا، نام ہونا ضروری ہے، ایک صاف شفاف ماضی ہونا ضروری ہے۔ماں باپ ہونا ضروری ہے۔اور میرے پاس ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔''اُس نے آہستگی سے کہتے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔اُسے لگا شاید وہ کبھی جزا کا ہاتھ نہیں مانگ سکے گا۔

''اچھا ہونا کافی ہے رضا! اچھا ہونا ہی کافی ہے۔۔۔''نوید کی نرم آواز پر اُس نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔

''نام رکھنے والے، خاندان رکھنے والے، اور صاف شفاف ماضی رکھنے والے بھی ذہنی مریض نکل آتے ہیں۔زندگی برباد کر دیتے ہیں، اچھا ہونا ہی اہم ہے۔''اُس نے یقین دلاتے انداز میں کہا۔

''تم بہت اچھے انسان ہو۔پڑھے لکھے ہو، قابل ہو، انسان دوست دل رکھتے ہو۔یہ کافی ہے۔''اُس نے دل سے کہا تو رضا مسکرایا۔

''لیکن۔۔۔''نوید رکا اور چہرے سے ساری مسکراہٹ غائب کی۔

''میں تمہیں ہرگز اجازت نہیں دوں گا کہ تم بیچ گلی میں کھڑے ہو کر میری بہن کو پروپوز کرو۔''اُس نے کہا تو سنجیدگی سے تھا پر آنکھوں میں کوئی چمک سی تھی، رضا کی ساری مسکراہٹ اُڑن چھو ہو گئی۔

''مم۔۔۔میں تو۔۔۔بس۔۔۔''وہ ہکلایا، تو تلایا، گڑبڑایا۔۔۔

''وحید بھائی اگلے ہفتے آئینگے، عائشہ جی کو لے کر آجانا بات کرنے۔''اُس نے ہونٹوں کے کناروں پر مسکراہٹ روکتے کہا، جبکہ رضا ہکا بکا رہ گیا۔

''کیا۔۔۔ کیا سچ میں؟'' اُسے یقین نہیں آیا۔

''ہاں!'' پہلی بار نوید نے اُسکی حالت سے حظ اٹھاتے مسکراہٹ چھپائی نہیں۔

''تمھیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟'' وہ اب تک بے یقین تھا۔

''جزا کو نہیں ہے، تو مجھے بھی نہیں ہے۔'' اُس نے کندھے اچکائے تو رضا کا وجود ہلکا پھلکا ہو گیا۔

''پر وحید بھائی کو میرے بارے میں۔۔۔'' وہ کچھ کہنے لگا۔

''اُنکی فکر نہ کرو، میں دیکھ لوں گا۔'' اُس نے بات کاٹتے کہا تو رضا نے تشکر آمیز نظروں سے اُسے دیکھا۔

''لیکن۔۔۔'' نوید کی مسکراہٹ ایک مرتبہ پھر سنجیدگی میں ڈھلی تو وہ سیدھا ہوا۔ جی جی! بالکل تیر کی طرح۔۔۔

''تب تک تم مجھے جزا کے آس پاس نظر نہ آنا۔ ورنہ میری غیرت کبھی بھی جاگ سکتی ہے۔'' اُس نے کہا تو رضا نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنی آنکھیں پیاری تھیں اُسے۔۔۔

''تھینکس!'' وہ گاڑی سے اترا تو رضا نے دل سے کہا، وہ سر ہلاتے اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اور بات ہے کہ گھر کے دروازے تک آتے آتے وہ مسکرایا ضرور تھا۔

----------+---------+--------

کمرے کے پردے ہٹے ہوئے تھے، باہر لان میں مالی کاٹ چھانٹ کرتا نظر آ رہا تھا۔ سامنے ٹیبلٹ کھلا تھا جس پر عمر، مقدّم کے ولیمے کے ایونٹ کے لیے اسٹیج ڈیزائن کر رہا تھا۔ یہ اُسکی طرف سے مقدّم کو تحفہ تھا۔ جب کام کرتے کرتے تھک گیا تو ٹیبلٹ رکھ کر گردن پیچھے گرا لی۔ پھر یونہی، سر پیچھے گرائے باہر لان میں دیکھا، مالی کاٹ چھانٹ کر کے اب کچرا صاف کر رہا تھا۔

اب وہ بغیر اسٹک کے چلنے لگا تھا۔ بس تھوڑی تکلیف ہوتی تھی، لیکن پہلے سے کہیں بہتر تھا۔ علی کے ہزار بار منع کرنے کے باوجود کل وہ آفس بھی چلا گیا تھا۔ اِس پر وہ خوب خفا بھی ہوا تھا کہ اُسے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مقدم اکثر ملنے چلا آتا، کبھی ساتھ لے کر چلا جاتا کہ مجھے شاپنگ کرنی ہے۔ رضا، علی، حسین اور نوید بھی روزانہ فون کر کے خیریت دریافت کر لیتے، فون نہ کر پاتے تو میسج کرنا کبھی نہ

بھولتے۔اظہر کا کیس بھی چل رہا تھا۔عمر نے حسین کی خاطر ایمان کو معاف کر دیا تھا،حالانکہ حسین نے ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا پر اُس نے کر دیا تھا۔آخری اطلاعات کے مطابق وہ ملک سے باہر جا چکی تھی۔مقدّم کی شادی تین روز بعد تھی۔رضا نے بھی اپنی نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا،یہ خوش خبری بھی اُس تک پہنچ چکی تھی۔امی ابوُ سے معاف کر چکے تھے،ہر شے اپنی جگہ پر آ چکی تھی۔لیکن۔۔۔

اُس نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا،وہ اب بھی خالی ہاتھ تھا۔

ہاں!صرف وہی تو خالی ہاتھ تھا۔

اپنی ہتھیلیوں کو بند کرتے اُس نے ایک مرتبہ پھر سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔مالی جا چکا تھا،لان خالی تھا۔سارے میں سناٹا چھا گیا تھا۔وہ کافی دیر یونہی پڑا رہا،پھر کسی ننھے ننھے ہاتھوں کا لمس اپنے پیروں پر محسوس ہوا تو آنکھیں کھولیں۔

''بابا!''

یہ خواب تھا؟یا مذاق تھا؟وہ جاگ رہا تھا یا اب بھی سویا ہوا تھا؟

عمائمہ اُسکے سامنے کھڑی تھی،گلابی رنگ کے پھولوں والے فراک میں،بالوں کی دو پونیاں بنائے،پہلے سے بڑی بڑی سی۔

''بابا!''عمر کے جواب نہ دینے پر پھر پکارا۔وہ جواب کیا دیتا؟وہ تو حیرت کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔پتھر کا بت۔۔۔

بے یقین سا۔۔۔

بے قرار سا۔۔۔

''عمائمہ!''اُس کے لب ہلے۔

''بابا!''اب کہ وہ روہانسی ہوئی۔

''میری بیٹی۔۔۔''وہ تیزی سے اٹھا اور اُسے گود میں اٹھا کر گلے لگا لیا۔ایسا کرنے میں اُسے تکلیف ہوئی،زخم ابھی مکمل مندمل نہیں ہوئے تھے۔لیکن اِس تکلیف سے کوئی فرق نہ پڑا تھا۔

''میری بیٹی ! میری عمائمہ !۔۔۔''وہ بے قراری سے اسے چومتا کہہ رہا تھا۔بے چین دل کو سکون عطا ہونے لگا،زخم پر مرہم پھوار بن کر برسنے لگے تھے۔

''میری جان !''اب کہ اُس نے عمائمہ کو اپنی نظروں کے سامنے کیا۔

''میری گڑیا نے یاد کیا تھا مجھے ؟''اُس نے پوچھا۔وہ حیران تھا کہ عمائمہ اُسے بھولی نہیں تھی،ورنہ اِس عمر کے بچے جلدی لوگوں کو بھلا دیتے ہیں۔

''ہاں ! میں نے یاد کیا۔۔۔''اُس نے سر ہلاتے زور وشور سے کہا،تو وہ نہال ہو گیا۔

''پر تم کیسے آئی ؟''اُسے یکدم ہی یاد آیا تو پوچھا۔اور اِس سے قبل وہ کوئی جواب دیتی عمر کی نظریں سامنے دروازے پر گئی اور وہ ٹھہر گیا۔

وہاں سرخ انگارہ آنکھوں سے اُسے دیکھتی عمارہ کھڑی تھی۔عمر کے ہاتھ کانپ اٹھے،پر اُس نے عمائمہ کو گود سے نہ اُتارا۔

عمارہ چلتی ہوئی اُسکے قریب آئی۔۔۔

براہِ راست اُسکی آنکھوں میں دیکھا۔۔۔

دکھ سے۔۔۔کرب سے۔۔۔تکلیف سے۔۔۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟''اُس نے ضبط کی شدت سے لال ہوتی آنکھوں سے اُسے دیکھتے پوچھا۔عمر کو سمجھ نہ آیا وہ کیا پوچھ رہی ہے ؟

''تم ہر بار ایسا کیوں کرتے ہو ؟ تم ہمارے حصے کے فیصلے خود کیوں کر لیتے ہو ؟ ہمیں کیا جاننا ہے اور کیا نہیں،اِسکا فیصلہ ہمیں کرنے دو عمر ! یہ تمہارا حق نہ تھا کہ تم ہماری طرف سے تمام فیصلے لے لیتے۔''اُس نے بھڑکتے ہوئے کہا تو عمر ساکت رہ گیا۔

''کیوں ؟ کیا سمجھتے ہو تم ؟ بہت بڑا احسان کیا تم نے ہماری ذات پر ؟ بہت بڑے غم سے بچا لیا تم نے ہمیں ؟ بہت خوش ہیں ہم ؟''وہ چیخی تھی۔

''تمہیں پتہ چل گیا سب ؟''اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

''ہاں! اور یہ بھی کہ تم نے ایک مرتبہ پھر وہی کیا۔ جب واپس آ گئے تھے تو سچ بتانے کے بجائے پھر اُسے چھپانے کا فیصلہ کیا، ہمیں انجان رکھنے کا فیصلہ کیا۔ تب بھی دل نہ بھرا تو اب ایک بار پھر۔۔۔'' اُسکی آواز بھرائی۔ ''ایک بار پھر تم نے انکل آنٹی سے جھوٹ کہا۔ تم سچ کیوں نہیں بولتے عمر؟ تمہیں لگتا ہے، تمہارے جھوٹ سے ہم بہت خوش ہوں گے؟ دیکھو!۔۔۔ دیکھو! کیا خوش ہیں ہم؟'' وہ بول رہی تھی اور عمر کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا اُس نے غلط کیا، پر اِس مرتبہ تو اُسے نا چاہتے ہوئے بھی جھوٹ بولنا پڑا تھا۔

''تم کیوں ایسے کرتے ہو؟'' وہ جیسے تھک گئی تھی۔

''اگر تم واپس آنے کے بعد بھی سچ بول دیتے تو خضر تمہارے ساتھ کچھ اچھا وقت گزار لیتا، وہ دل میں تم سے ملنے کی چاہ لیے دنیا سے نہ جاتا۔'' اُس نے دکھ سے کہا تو عمر کی آنکھوں سے ایک قطرہ آنسو بہہ نکلا۔

''میں تم سب کو تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔ پر۔۔۔ میرا طریقہ غلط تھا۔ اگر میں وہ سب نہ کرتا تو شاید خضر زندہ۔۔۔''

''نہیں!'' عمارہ نے اُسکی بات کاٹی۔ ''وہ زندہ نہیں ہوتا، کیونکہ اُسکی موت اُسی روز لکھی تھی، اُسے اُسی روز مرنا تھا۔ جیسے تمہاری موت نہیں لکھی تھی۔ تم دو مرتبہ موت کے منہ سے واپس چلے آئے۔ اُسکی موت کا قصور خود کو مت دو۔'' اُس نے سمجھانا چاہا۔

''عمارہ! مجھے معاف کر دو۔ ان سب میں سب سے زیادہ نقصان تمہارا ہوا ہے۔'' اُس نے کہا۔

''نقصان تو تمہارا بھی ہوا ہے۔'' عمارہ نے اُسے بغور دیکھا۔

''میرے نقصان میں میرا قصور ہے، تمہارا نقصان میری وجہ سے ہے۔ مجھے معاف کر دو! اگر کر سکو تو۔''

''میں تمہیں کبھی معاف نہیں کرتی اگر۔۔۔'' عمارہ نے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے کہا۔ ''اگر تم نے مجھے دھوکا دیا ہوتا، میرے اوپر اپنی خوشیوں کو ترجیح دی ہوتی، تو میں تمہیں کبھی معاف نہ کرتی۔ لیکن۔۔۔ لیکن تم نے جو بھی کیا، تمہاری نیت کبھی مجھے دھوکا دینے، میری خوشیاں چھیننے کی نہیں تھی۔ تم میرا بھلا چاہتے تھے، تمہاری نیت صاف تھی۔ بس! طریقہ غلط تھا۔ اِس لیے میں تمہیں معاف کر چکی ہوں۔ نہ کرتی تو واپس نہ آتی۔'' اُس نے کہا تو عمر نے سر جھکا کر آنکھیں بند کیں، رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔ پھر دوبارہ چہرہ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ تشکر سے، احسان مندی سے۔۔۔

''تم واپس تو نہیں جاؤ گی؟''اُس نے پوچھا۔

''معلوم نہیں! لیکن جب تک یہاں ہو، تم عمائمہ کہ ساتھ رہ سکتے ہو۔ یہ ویسے بھی تمہیں کبھی نہیں بھولی، مجھے اعتراض نہیں ہے۔''اُس نے کہا۔

''شکریہ!''عمر نے احسان مندی سے کہا تو وہ سر ہلاتے جانے کے لیے مڑی۔

''عمارہ!''اُس نے پکارا تو وہ پلٹی۔

''کیا میں اپنے بھائی کی امانت ساری زندگی سنبھال سکتا ہوں؟''پوچھنے کا کتنا پیارا انداز تھا؟ایک تو وہ تھا بھی پیارا، اوپر سے کچھ معصومیت بھی چہرے پر سجا کر پوچھا تھا۔

''ساری زندگی؟''عمارہ نے اُسکے الفاظ دہرائے۔

''ہاں! اب دور رہنا بہت بڑی سزا ہے میرے لیے۔ جب معاف کر ہی دیا ہے تو سزا بھی نہ دو۔''اُس نے مزید معصومیت سے کہا۔

''تمہاری بیٹی ہے، تمہارے بھائی کی امانت ہے۔ تمہاری مرضی!''اُس نے کندھے اُچکائے۔

''میں نے دونوں کی بات کی ہے۔''عمارہ رک گئی۔۔ ٹھہر گئی۔۔۔ تھم گئی۔۔

عمر آنکھوں میں درخواست لیے، ڈھیروں خواہشات لیے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''سوچوں گی۔''وہ بھی کندھے اُچکاتے، ذرا مسکراتے وہاں سے چلی گئی۔

''میں انتظار کروں گا۔''وہ مسکراتے ہوئے بولا پھر عمائمہ کو سینے میں بھینچ لیا۔

----------+---------+--------

''تم نے میرا سوٹ نکال دیا ہے؟''نوید ابھی ڈیوٹی سے گھر پہنچا تھا۔ رات مقدم کا ولیمہ تھا۔

''ہاں! نکال بھی دیا ہے، اور استری بھی کروا دیا ہے۔''اُس نے کہا۔

''تم بھی تیار ہو جاؤ، ہم نو بجے نکل جائیں گے۔''نوید نے کہا۔

''پہلے ولید کو تیار کر دوں، پھر۔۔۔اچھا! وہ تمہاری ٹائی مجھے نہیں ملی۔ تم دیکھ لینا خود!'' ولید کو شرٹ پہناتے، اُس نے مصروف سے لہجے میں کہا۔

''اوکے!'' وہ الماری کھول کر کے اپنی ٹائی تلاشنے لگا۔ یکدم ہی اُسکی نظر ایک بیگ پر پڑی۔

''یہ بیگ کس کا ہے بشریٰ؟''اُس نے الماری میں منہ دیئے ہی آواز دے کر پوچھا۔

''کونسا؟''اُس نے رک کر دیکھا۔

''یہ ولید کا سامان ہے۔ پچھلے دنوں رضا بھائی نے بھجوایا تھا جزا کے ہاتھوں۔ میں مصروف تھی تو کھول کر دیکھ نہ سکی۔''اُس نے بتایا۔

''اوہ!'' وہ سر ہلاتے یونہی بیگ کھول کر دیکھنے لگا، عادت سے مجبور۔۔۔کہ اُسے ایک یو ایس بی نظر آئی۔

''یہ کیا ہے؟''اُس نے حیرت سے دیکھا۔ یو ایس بی پر پیپر ٹیپ لگا تھا، جس پر رضا کی رائٹنگ میں لکھا تھا''میموریز (یادیں)''۔ وہ یو ایس بی لے کر اپنے پلنگ پر آیا اور لیپ ٹاپ کھولا۔ بشریٰ نے اُس پر دھیان نہ دیا۔ لیپ ٹاپ میں یو ایس بی لگا کر اُس نے دیکھا تو وہاں پر صرف ایک فولڈر تھا۔ جسکا نام ولید تھا۔ فولڈر کھولا تو اندر مزید فولڈر تھے۔ کسی پر فوٹوز لکھا تھا، کسی پر ویڈیوز، تو کسی پر ڈاکومنٹس۔ اُس نے ڈاکومنٹس کا فولڈر پہلے کھول لیا۔ اُس میں ولید کا برتھ سرٹیفکیٹ، ویکسین کی تفصیلات، اور مزید چیزیں تھی۔

اُس نے تصاویر کا فولڈر کھولا تو اُسکی اُنگلیاں تھم گئیں۔ وہاں لاتعداد تصاویر تھیں، وہ پہلا دن جب وہ اُسے ملا تھا، اور پھر جب تک اُسکے پاس رہا تب تک کی مختلف تصویریں تھیں۔

''کیا ہوا؟''بشریٰ نے اُسے حیرت کا مجسمہ بنے دیکھا تو پوچھا۔

''یہاں آؤ!''اُس نے بشریٰ کو بلایا تو وہ وہیں آ گئی۔

''کیا ہوا؟''اُس نے پوچھا تو نوید نے لیپ ٹاپ اِسکی جانب گھما دیا۔

''یہ۔۔۔یہ ولید ہے؟''بشریٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں!''اُس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

''یہ کہاں سے ملی؟''وہ تصویریں آگے بڑھا کر دیکھنے لگی۔

''رضا نے جو سامان دیا تھا اُسی میں تھی۔''وہ نم آنکھوں سے تم تصویریں دیکھنے لگی، پھر ویڈیوز۔۔۔اُسکے چلنے کی ویڈیو، اُسکے بولنے کی، ہنسنے کی، کھیلنے کی، شرارتیں کرنے کی، ہر ہر لمحہ رضا نے قید کرر کھا تھا۔اور بشریٰ۔۔۔اب ہر اُس لمحے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، جسکا غم کب سے اُسکے دل میں تھا۔

''نوید دیکھو! اُسکے دانت نہیں نکلے تھے تب۔۔۔''وہ دکھانے لگی، وہ ہر ہر ویڈیو پر اسے ایسے ہی پر جوش ہو کر کچھ نہ کچھ دکھانے لگتی، جبکہ نوید فقط اُسکے مسکراتے، خوش چہرے کو دیکھتا رہتا۔

آج رضا نے اُس پر ایک اور احسان کر دیا تھا۔

--------+---------+----------

''تم نے اِس قدر سڑا ہوا منہ کیوں بنا رکھا ہے؟''استقبالیہ پر کھڑے، اپنے مہمانوں کا انتظار کرتے مقدم نے ساتھ کھڑے حسین سے پوچھا، جو کافی دیر سے سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سیاہ تھری پیس میں آنکھوں پر آج سیاہ فریم والا چشمہ ہی لگا رکھا تھا۔ تھوڑا وہ پیارا بھی تھا، اور تھوڑا معصوم بھی۔

''یہ سوال تھوڑی دیر بعد کرنا۔''اُس نے سنجیدگی سے کہا، تو آپس میں محو گفتگو نوید اور عمر نے چونک کر اُسے دیکھا۔

''کیوں ابھی کیوں نہیں پوچھ سکتے؟''مقدم نے پوچھا۔

''تھوڑی دیر بعد یعنی، جب حور آس پاس نظر آئے، تب پوچھنا اور یہ مت پوچھنا، بلکہ یہ پوچھنا کہ حسین کیا ہوا ہے، تم ٹھیک ہو؟''

''ہیں؟''موبائل سے سر اٹھاتے علی کا ردعمل بیساختہ تھا۔

''کیوں؟''مقدّم کے بھی کچھ نہ سمجھ آیا تھا۔

''دیکھو! تھوڑا حور عین کو بھی احساس ہونا چاہیے کہ میں اُس سے ناراض ہوں۔''اُس نے کہا۔

''کیوں اُسکو احساس نہیں ہے؟'' مقدّم نے پوچھا۔

''صبح سے چار مرتبہ احساس دلوایا ہے، ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی کام دے جاتی ہے، اور کہتی ہے کہ پہلے یہ کرلو پھر ناراض ہو جانا۔'' اُس نے منہ بسورتے کہا تو وہ ہنسا۔

''ہاں! کیونکہ تم ناراض کم اور مضحکہ خیز زیادہ لگتے ہو۔'' علی نے بتایا تو حسین نے کمال بے نیازی سے نظرانداز کیا۔

''تم کدھر ہو؟'' کہیں سے رضا نمودار ہوا تھا۔

''مہمانوں کا استقبال کرنے کھڑا ہوں۔'' مقدّم نے جواب دیا۔

''استقبال کرنے کھڑے ہو یا وقت برباد کرنے، جاؤ! فوٹو گرافر بلا رہا ہے۔'' اُس نے مقدّم کو وہاں سے چلتا کیا تھا۔

''اِس سے اچھی تصاویر تو میں لے لیتا ہوں۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے چلا گیا۔ عمر اب پہلے سے بہتر تھا، صحت کے علاوہ اُسکے چہرے پر بھی ایک عجیب سی چمک تھی۔ نوید تو تھا ہی بے نیاز سا، کچھ وہ لگتا بھی مغرور تھا، کچھ اُسکے چہرے پر موجود نرمی تھی، کچھ بھٹکی نگاہیں تھیں جو بار بار دور بیٹھی بشریٰ کا طواف کرکے واپس آجاتیں۔ آج وہ میرون لباس میں تھی، وہ بھی نوید کی فرمائش پر۔ علی پہلے سے زیادہ مطمئن، پہلے سے زیادہ بردبار اور سمجھدار لگنے لگا تھا۔ اور رضا تو اب ہی جینے لگا تھا۔

اور حسین؟

حسین اِس وقت خود کو ماڈل سمجھے کھڑا تھا، کیمرہ مقدّم کے ہاتھوں میں تھا اور فوٹو گرافر سخت تاسف سے دور کھڑا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''چلو! تم ذرا اپنا چشمہ اُتارو!'' مقدّم بھول گیا کہ وہ دلہا ہے۔

''خبردار! چشمے کے ساتھ ہی تصویر لو، یہ میری پہچان ہے۔'' اُس نے صاف انکار کیا۔

''عقل سے پیدل انسان! چشمے پر عکس پڑ رہا ہے، تمہاری حسین آنکھیں چھپ رہی ہیں۔'' اُس نے دانت کچکچاتے کہا۔

''اوہ! تو یوں کہو نا!'' اُس نے شرمانے میں عورتوں کو بھی مات دیتے چشمہ اُتارا تو مقدّم نے اُسے گھورا۔ اِس سے قبل کہ وہ تصویر کھینچتا حور عین اُسکے سامنے آگئی اور تصویر ایسے ہی کلک ہو گئی۔

''یہ کیا بد تمیزی ہے؟'' حسین چچا، اور حور عین کے منہ پر ہاتھ رکھتے اُسے پیچھے ہٹایا۔ اور یہ منظر بھی کلک کر لیا گیا۔

''اکیلے اکیلے تصویریں نہیں لے سکتے تم۔'' وہ بھی ڈھیٹ تھی دوبارہ سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

''جلدی کرو بھائی! مجھے اسٹیج پر بھی جانا ہے۔'' مقدّم نے بگڑتے ہوئے کہا۔

لیکن دونوں اب لڑتے لڑتے کسی بات پر ہنسنے لگے تھے، منظر کیمرے کی آنکھ میں ہمیشہ کے لیے مقید ہو گیا۔

چند روز مزید سر کے تو عمر نے نکاح پر سب کو بلا لیا۔ عمارہ نے سادگی سے نکاح کرنے کی خواہش کی تھی اور وہ بخوشی راضی ہو گیا تھا۔ اُسکے نکاح کے لیے مقدم نے سوات جانے کا منصوبہ ذرا آگے بڑھا دیا تھا۔

''آپکو پتہ ہے؟ میں کلاس ون میں آگئی ہوں۔ اب میں پرائمری میں ہوں، میں بڑی ہو گئی ہوں۔'' نکاح سے کچھ دیر قبل نشمیہ نے عمر کا دماغ کھانا ضروری سمجھا تھا۔ وہ بھی خوشی خوشی اُسکی ہر بات سن رہا تھا، عمائمہ اُسکی گود میں بیٹھے، بڑے شوق سے نشمیہ کو دیکھ رہی تھی۔ غالباً دونوں باپ بیٹی کو وہ پسند تھی، اُس نے علی کو خاص تاکید کی تھی کہ اُسے ساتھ لے کر آئے۔

''نائس! اب تم نے اچھے سے پڑھنا ہے۔'' عمر نے کہا۔

''اب میں بڑی ہو گئی ہوں، اور اب میں پائلٹ بن جاؤں گی۔'' اُس نے چیختے ہوئے اعلان کیا تھا۔

''نشمی آہستہ!'' علی نے اُسے ٹوکا۔

''تم ابھی پائلٹ بن جاؤ گی؟'' نوید کو لگا جیسے اُس نے سننے میں غلطی کی ہے تو تصدیق کے لیے پوچھ لیا۔ نشمیہ نے پلٹ کر اُسے دیکھا، جیسے وہ پسند نہ آیا ہو۔

''جی!'' اُس نے سر ہلاتے یک لفظی جواب دیا۔

''پائلٹ بننے کے لیے بڑا ہونا پڑتا ہے۔'' نوید نے اُسکے علم میں اضافہ کیا۔

''میں بڑی ہو چکی ہوں۔ میں پرائمری میں ہوں اب!'' دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر نوید کو جتایا۔

''نہیں! تھوڑااور بڑاہوناپڑتاہے۔''اُس نے سمجھانے والے انداز میں کہا، یہ اُسکی نشمیہ سے پہلی باضابطہ گفتگو تھی(بحث تھی)۔

''اور بڑا؟''وہ حیران ہوئی۔

''ہاں!''

''کتنا بڑا؟''ذرامایوس بھی ہوئی۔کیامطلب اور کتنابڑاہوناپڑے گا؟

''باباجتنا بڑا۔''نوید نے علی کی جانب اشارہ کرتے کہا۔باقی سب دلچسپی سے یہ مباحثہ سن رہے تھے۔

''باباجتنا؟''یقین نہ آیا۔

''ہاں!''

''اِنکے جتنا؟''انگلی سے علی کی جانب اشارہ کرتے ایک مرتبہ پھر تصدیق چاہی۔

''ہاں! اِنکے جتنا۔''نوید نے تصدیق کردی، تووہ کچھ لمحے دکھ اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں کبھی اُسے تو کبھی علی کو دیکھتی رہی،اُسکے تاثرات پر علی کے لیے ہنسی روکنا مشکل تھا۔

''پر۔۔۔''اُس نے کہاپھر رکی، ننھے چہرے پرمایوسی جیسے تاثرات آئے۔''تب تک تومیں بڑھی ہوجاؤں گی۔''اور وہاں چھت پھاڑ قہقہ پڑا تھا۔

''کیامطلب میں بڈھاہوں؟''علی نے ذرا ناراضگی سے پوچھا۔

''ہاں!''ڈھیٹ تووہ اپنے نام کی ایک تھی۔

''بچے من کے سچے!''حسین نے لقمہ دیاتوایک بار پھر سب ہنس پڑے تھے۔

--------+---------+----------

**ایک سال بعد:**

بارش زور و شور سے برس رہی تھی۔ موسم بھی ٹھنڈا تھا۔ گاڑی سے اتر کر سینٹرل جیل کی عمارت کی طرف بڑھتے مقدّم کے قدم سست روی کا شکار تھے۔ اپنا شناختی کارڈ ریسیپشن پر رکھوائے وہ پولیس کانسٹبل کے ساتھ اندر بڑھنے لگا۔ خاموش اور وحشت ناک راہداریوں سے ہوتا بالآخر وہ اُس کمرے میں پہنچا، جہاں عبیر شاہ پہلے سے موجود تھا۔

عبیر شاہ، لیلیٰ کا بھائی۔۔۔

لیلیٰ کا قاتل۔۔۔

مکرم کا باپ۔۔۔

نہ چہرے پر وہ جاہ و حشمت تھی، نہ ہی وہ رعب۔ وہ سوکھا، مریل سا آدمی کہیں سے بھی عبیر نہیں لگ رہا تھا۔ ہاتھوں اور پیروں تک میں بیڑیاں تھیں۔ مقدّم اُسکے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم نے عدالت میں عمر قید کی اپیل کیوں کی؟'' پہلا سوال، بنا کسی تمہید کے عبیر کی جانب سے آیا تھا۔

''میں تمھارے جتنا کم ظرف نہیں ہوں۔ میں نے ایسی کوئی اپیل نہیں کی ہے۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر عدالت نے مجھے پھانسی کیوں نہیں دی؟ سزائے موت سے عمر قید کیوں؟'' وہ ہذیانی انداز میں چیخا۔

''خاموش رہو!'' باہر کھڑے کانسٹیبل نے اندر جھانکتے ہوئے گھر کا تھا۔

''تمہاری بیماری کی پیش نظر عدالت نے از خود یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں پھانسی نہ دی جائے۔ تم خود ہی چند دنوں میں مر جاؤ گے۔'' مقدّم کے الفاظ میں کوئی رحم تھا نہ دل میں۔

''کیوں؟ کیوں؟ بیماری تو چار سالوں سے ہے، پر موت نہیں آئی۔ یہ کبھی نہیں آئے گی، میں موت کو ترس جاؤں گا۔ تم عدالت سے کہہ کر مجھے پھانسی دلوا دو۔'' لیلیٰ کا قاتل، ہاتھ جوڑ کر اپنے لیے موت مانگ رہا تھا۔

''مجھے معاف کر دو مقدّم! مجھے معاف کر دو۔ میں ظالم تھا، فرعون بن گیا تھا۔'' اب وہ معافی مانگ رہا تھا۔ مقدّم سپاٹ چہرے کے ساتھ اُسے دیکھ رہا تھا۔

''معافی نہیں ہے میرے پاس پر۔۔۔''عبیر نے اُسکی آواز پر چہرہ اٹھا کر دیکھا۔''پر میں تمہارے جتنا گھٹیا نہیں ہوں۔ تمہارے بیٹے کو تم سے ملنے کا حق ہے، اگلی بار اُسے تمہارے پاس لے کر آؤنگا۔اِس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' وہ جانے کے لیے کھڑا ہوا۔

''یہ مت کرنا۔ یہ سزا نہ دینا مجھے، میرے بیٹے کو میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ میں اُسکی نفرت برداشت نہیں کر سکوں گا۔ پلیز!''وہ رونے لگا۔ مقدّم نے کوئی جواب نہ دیا اور باہر نکل گیا۔ باہر آیا تو بارش پھوار میں تبدیل ہو چکی تھی۔ گاڑی سے ٹیک لگائے، اُسکے انتظار میں کھڑا اخلاق اُسے دیکھ کے مسکرایا۔

''تم ٹھیک ہو؟''قریب آتے پوچھا۔

''جس کے پاس تمہارے جیسا بھائی ہو وہ کیوں ٹھیک نہیں ہو گا۔''اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ! آئی ایم اونورڈ!''اُس نے دل پر ہاتھ رکھتے کہا پھر اُسکے گلے لگ گیا۔

''ہر چیز کے لیے شکریہ اخلاق!''مقدّم نے دل سے کہا۔

''یہ شکریہ کیا ہوتا ہے؟ ذرا شادی وادی کا سوچو میری۔ کب تک میں اکیلا پھرتا رہوں گا؟''اِس بات پر وہ ہنس پڑا۔

''یہ کام مجھے کرنا ہو گا؟''

''تو اور کون کرے گا؟ اب تو تم خیر سے گھر بار والے ہو۔ تم ہی کر سکتے ہو، بلکہ کرو گے۔''گاڑی کا دروازہ کھولتے اخلاق نے کہا تو وہ ہنسا۔

''چلو تو پھر بتادو کہ کس کے گھر جانا ہے اور کب؟''مقدم نے گاڑی میں بیٹھتے شرارت سے پوچھا تھا۔

''جلدی کس بات کی ہے؟''وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

جبکہ مقدم کے موبائل پر نوید کا میسج آیا ہوا تھا۔

----------+---------+--------

''یہ تھا وہ کمرہ، جہاں میں رہتا تھا۔اپنی کم مائیگی پر روتا تھااور سمجھتا رہتا کہ شاید زندگی میں کبھی کوئی خوشی نہیں آئے گی۔'' رضاالٰہی آج اپنی شریک حیات،اپنی متاع حیات جزا کے ساتھ،اپنے اُس پرانے کیبن میں کھڑا تھا، جس میں اُس نے ایک عمر گزاری تھی۔

''تم نے بہت برا وقت دیکھا ہے۔پر اُس بارے وقت نے تمہیں ہیرا بنا دیا ہے۔'' جزا نے اُسکا بازو تھامتے کہا۔

''ہاں ! لیکن ہر برا وقت، آنے والے اچھے وقت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔''اُس نے کہا۔ ''تمہیں پتہ ہے،اُس درخت کے نیچے ایک چارپائی رہتی تھی، شام میں اکثر کھیلتے کھیلتے جب میں تھک جاتا تھا،امی کی گود میں وہیں سر رکھ کر سو جاتا تھا۔'' وہ اشارہ کر کے اُسے وہی درخت دکھانے لگا۔ جزا نے آنکھ میں آئی نمی چھپائی تھی۔ پچھلے سات ماہ میں اُسے رضا نے اپنے ماضی کی تمام باتیں کہہ سنائی تھی، پچھلے سات ماہ میں جزا نے اُس سے بہتر کسی انسان کو نہ پایا تھا۔وہ دونوں اب پناہ گاہ میں رہتے تھے۔رضا نے اُس سے کوئی چاند تارے توڑ لانے کا وعدہ نہ کیا تھا۔بس اتنا کہا تھا کہ تمہاری عزت کروں گا، تمہاری رائے کو اہمیت دوں گا، تمہارے فیصلوں کا احترام کروں گا اور تمہیں انسان سمجھوں گا۔اور اُس نے ایسا کر کے دکھایا بھی تھا۔

بنگلے کا کونا کونا اُسے دکھاتے، اپنا بچپن اُسے سناتے بالآخر وہ لاونج میں آیا، جہاں ماموں پہلے سے بیٹھے تھے۔پہلے سے ضعیف اور لاغر، البتہ گھر کے حالات اب بہتر تھے۔اُنکی بیٹی کمانے لگی تھی، تنخواہ سے اچھا گزر بسر ہو رہا تھا۔

''بہو کو پہلی بار لائے ہو، کچھ کھائے پیے بنا مت جانا۔'' مامی نے اُس سے درخواست کی تو وہ خلاف توقع سر ہلاتے بیٹھ گیا۔وہ بخوشی اُنکے لیے چائے اور دیگر لوازمات لے آئیں۔ جبکہ رضا ماموں سے اُنکی صحت کے متعلق پوچھے لگا۔

''خدیجہ گھر ڈھونڈ رہی ہے۔ جلد مل جائے گا تو ہم خالی کر دیں گے۔''اُنہوں نے اپنی بیٹی کا نام لیتے بتایا۔

''آپ کو گھر خالی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' رضا کی مستحکم مگر نرم آواز گونجی تو سب کو دھچکا لگا سوائے جزا کے۔

''یہ گھر میں نے آپکے نام کر دیا ہے۔اب آپ ساری عمر اِس میں سکون سے رہ سکتے ہیں۔اگر ضرورت ہو تو میں گھر میں رینوویشن کروا دونگا۔آپ زائد حصّے کو کرائے پر چڑھا سکتے ہیں۔''اُس نے آہستگی سے کہتے جزا کو اشارہ کیا تو اُس نے اپنے پرس سے فائل نکال کر اُسکے حوالے کی۔رضا نے فائل ماموں کی جانب بڑھائی تو انہوں نے اُسکا ہاتھ تھام لیا اور بلک بلک کر رو دیئے۔رضا تو ہڑ بڑا گیا۔

''ماموں!''اُس نے پریشانی سے پُکارا۔پر وہ آستینوں سے آنسو پونچھتے روتے رہے۔تو پہلی بار، بالکل پہلی بار رضا کو اُن پر ترس آیا۔وہ اٹھ کر اُنکے پاس آیا۔

''مجھے معاف کر دو!''وہ کہنے لگے۔

''میں معاف کرتا ہوں آپکو۔جو بھی ہو، پر آپ نے مجھے کھلایا پلایا اور مجھے پڑھایا بھی۔احسان تو ہے آپکا۔''حالانکہ کوئی احسان نہیں کیا تھا، وہ اُسکے باپ سے پیسے لیکر ہی اُس پر خرچ کرتے تھے۔لیکن رضا نے جب اُنہیں معاف کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تو مزید کوئی شکوہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

بنگلہ ہمیشہ کے لیے اُنکے حوالے کر کے، اُن سے ملنے آنے کا وعدہ کر کے، اور اُنکو معاف کر کے جب وہ باہر نکلا تو اُسکا دل بہت ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔اب کوئی بوجھ نہ تھا۔

''مجھے تم پر فخر ہے۔اور یقیناً تمہاری امی کو بھی ہوگا۔''گاڑی میں بیٹھنے کے بعد جزا نے اُس سے کہا تھا۔

''تھنک یو!تم نہ ہوتی تو شاید میں یہ فیصلہ کبھی نہ کرتا۔''اُس نے دل سے کہا۔سچ تو یہ تھا کہ جزا نے ہی اُسے یہ احساس دلایا تھا کہ انتقام میں جلنے والے کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔وہ بھی اپنے بھائیوں سے ناراض رہی اور پھر اُتنا ہی پچھتاتی رہی تھی۔

اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتی، رضا کا موبائل بج اٹھا۔ڈیڑھ سال قبل نوید نے مائیکل کے نام سے جو گروپ بنایا تھا، جسکا نام تبدیل کر کے حسین نے کچھ اور ہی کر دیا تھا۔اُسی پر نوید کا میسیج آیا ہوا تھا۔تین عدد تصویریں اور ایک چھوٹا سا پیغام۔

''جزا!''پیغام دیکھ کر رضا نے اُسے تیزی سے پکارا تھا۔

''کیا ہوا؟''وہ گھبرائی۔

''ہمیں فوراً نکلنا ہے۔''اُس نے موبائل جزا کے حوالے کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

----------+---------+--------

''اوہو!آپ کو گول روکنا تھا بابا!''لان میں احمد کی جھنجھلائی سی آواز گونج رہی تھی۔

''اوہ! مجھے روکنا تھا؟'' علی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! آپکو نشمیہ کا گول روکنا تھا۔''اُس نے سر پہ ہاتھ مارتے کہا۔

''اوہ! مجھے لگا کہ یہ تمہارا گول ہے۔'' علی نے کھسیا کر کان کھجاتے کہا۔

''آپکو اور نشمیہ دونوں کو کھیلنا نہیں آتا۔'' وہ ناراض منہ بناتا کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ مسکرایا۔ آج کل اُس پر اپنی بہن کا خوب رنگ چڑھ رہا تھا۔

''اوہو! بھائی تو ناراض ہو گیا۔''نشمیہ نے علی کے قریب آکر سرگوشی کی۔

''غلط بات ہے، تمہاری وجہ سے میں نے چیٹنگ کی ہے، اب نہیں کروں گا۔''اُس نے آنکھیں دکھاتے کہا پھر اُسے گود میں اٹھاتا وہیں آکر بیٹھ گیا۔

''ہم بہت برے کھلاڑی ہیں، لیکن تم ایک اچھے کوچ ہو۔ اور تم ہمیں جلدی سکھا دو گے۔'' علی نے احمد کی ناراضگی دور کرنی چاہی۔

''اتنے ٹائم سے سکھا رہا ہوں، آپ دونوں ہی نہیں سیکھتے۔'' وہ روٹھا روٹھا سا پیارا لگا۔

''سیکھنے میں وقت تو لگتا ہے نا!'' علی نے کہا۔

''میں نے تو ڈرائنگ جلدی سیکھ لی۔''اُس نے جتایا۔

''کیونکہ میں نے سکھایا اچھا تھا۔''نشمیہ نے بیچ میں بولا تو علی ہنس پڑا۔

''کھیل کو د بعد میں، پہلے کچھ کھا لو۔'' ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے فاطمہ کی چہکتی ہوئی آواز کانوں میں پڑی تو سب نے اُسے دیکھا۔

''جاؤ جلدی سے ہاتھ دھو کر آؤ دونوں!'' علی نے کہا تو دونوں لان میں لگے نل کی طرف بھاگے۔

''خوشبو تو بہت اچھی آ رہی ہے۔ کیا بنایا ہے؟'' علی نے ٹرے میں جھانکتے پوچھا۔

''لوڈیڈ فرائیز!'' جواب دیتے وہ چائے کی پیالیاں میز پر رکھنے لگی۔ ہلکے گلابی رنگ کے لباس میں وہ پہلے سے زیادہ کھلی کھلی لگ رہی تھی۔

''پیاری لگ رہی ہو۔'' علی نے تعریف کرنا مناسب سمجھا۔

''بڑھاپا آنے والا ہے کچھ دنوں میں، آج ہی دیکھا میرے کچھ بال بھی سفید ہو رہے ہیں۔''اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لو! مجھے دیکھو! میرے تو اب بال ہلکے ہونے لگے ہیں۔ فکر ہو رہی ہے کہ کہیں گنجا ہی نہ ہو جاؤں۔ مجھ سے تو جوان ہی ہوا ابھی۔''اُس نے بھی منہ بناتے ہوئے کہا تو فاطمہ نے آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے بغور دیکھا۔

''کوئی نہیں! مجھے تو بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہیں تمہارے بال۔''اُس نے کہا۔

''ارے واہ فرائیز!''نشمیہ اپنی من پسند شے دیکھ کر خوشی سے چہکی تھی۔

''میں نکال کر دیتی ہوں، دونوں جگہ پر بیٹھو پہلے۔''وہ بچوں کو کہتے پلٹ میں فرائیز نکالنے لگی۔ آسودگی سے مسکراتے علی نے اپنے موبائل کی روشن ہوتی اسکرین دیکھی، تو وہاں نوید کا میسیج نظر آیا۔اُس نے فون اُٹھا کر دیکھا۔

''اوہ!''پیغام دیکھ کر اُسکے لبوں سے نکلا۔ پھر وہ بیساختہ مسکرا اٹھا۔ وہاں ہسپتال کے جھولے میں لیٹی تین عدد نومولود بچیوں کی تصویر تھی۔ گلابی، نیلے اور نارنجی لباس میں ملبوس ننھی ننھی سی پریاں سوئی ہوئی تھیں۔

نیچے پیغام لکھا تھا۔

''میری بیٹیاں! جنت، منت اور آیت''

----------+---------+--------

## ''اور عنقریب میں تمہیں اتنا دونگا کہ تم راضی ہو جاؤ گے''

انسان شکوہ کرنے پر آتا ہے تو کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ رب کی نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔

اور رب نوازنے پر آتا ہے تو نوازتا ہی چلا جاتا ہے، بندے کے گناہ و نافرمانیاں بھلا دیتا ہے۔

رضا بھی رب کے نوازنے کو دیکھ رہا تھا۔ نوید سامنے تھا، وارڈ سے باہر تینوں بچیوں کو بے بی باسینیٹ میں اُسکے پاس لایا گیا تاکہ وہ اُنکے کانوں میں اذان اور اقامت کہہ دے۔ اب وہ اُنہیں گود میں لیے پیار کرتا اور باری باری اذان دیتا تھا۔ جزا، بشریٰ سے ملنے وارڈ گئی تھی۔ ولید بھی

اپنی بہنوں سے ملنے آیا تھا۔ رضا ساتھ ہی تھا۔ بشریٰ کل سے ہسپتال میں تھی، وہ لوگ جانتے تھے کہ کسی بھی وقت خبر آسکتی ہے۔ لہٰذا ہسپتال جانے سے قبل رضا ماموں سے ملنے چلا گیا، واپسی پر خبر ملی تو جزا کو لیے سیدھا یہیں آ گیا۔

ولید بے بی باسینیٹ پکڑے، اپنے سے چھوٹے چھوٹے وجود کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔

''یہ بے بی ہے؟'' ولید نے اپنے باپ سے پوچھا۔

''ہاں!'' اُس نے پیار سے کہا۔ پھر سوئی ہوئی اپنی ننھی پریوں کو دیکھا۔ دل محبت سے اتنا بھر گیا تھا جیسے پیالے سے چھلک کر دودھ گرتا ہو۔ جذبات کا اظہار مشکل ہو گیا تھا۔ خوشی تھی کہ سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔

''مبارک ہو تمہیں!'' رضا نے اُسے کہا۔

''شکریہ، یہ دیکھو، یہ مجھ سے مل رہی ہے نا!'' اُس نے خوش ہوتے رضا سے پوچھا۔

''ہاں! یہ تمہاری جیسی ہی ہے۔ لیکن تمہیں پتہ کیسے چلے گا کہ جنت کونسی ہے؟ منت کونسی اور آیت کونسی والی؟'' رضا نے پوچھا تو نوید نے تینوں کو دیکھا اور ذرا کان سہلاتے کچھ سوچنے لگا۔ اُسکے ہونق انداز پر رضا ہنسنے لگا۔

''اب مجھے کیا پتہ تینوں میں سے کون، کون ہے؟ مجھے تو بس نام پتہ ہے۔ اب کس کو کونسا نام الاٹ (مختص) کرنا ہے، یہ اُنکی ماں بتائے گی۔'' اُس نے حتمی انداز میں کہا۔

''یہ سو کیوں رہی ہیں؟'' ولید کو اُنکے سونے پر اعتراض تھا۔

''کیونکہ یہ چھوٹی ہیں نا!'' نوید نے اُسے اپنے قریب کرتے سمجھایا۔

''تو چھوٹے بچے ہر وقت سوتے ہیں؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں! تقریباً ہر وقت!''

''تو پھر میں کھیلوں گا کیسے؟'' وہ پریشان ہوا تو نوید ہنسا۔

''جب یہ تھوڑی بڑی ہو جائیں تب کھیلنا۔''اُس نے کہا۔

''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟'' جزا کی خفا آواز کانوں میں پڑی تو نوید نے چہرہ موڑ کر رضا کو دیکھا اور بولا۔

''تمہیں بلا رہی ہے۔''

''تاریخ گواہ ہے کہ اتنے پیار سے وہ صرف اپنے بھائی کو ہی بلاتی ہے۔''رضا نے بھی دوبدو جواب دیا۔

''رضا! میں تم سے کہہ رہی ہوں۔'' جزا سروں پر پہنچی۔ ''کب سے کہہ رہی ہوں شزا کا ایگزیبیشن ہے آج، تمہیں وہاں جانا چاہیے۔ میں ہوں نا یہاں۔ لیکن تم ہو کہ سن ہی نہیں رہے۔''اُس نے ناراضگی سے کہا۔

''کبھی کبھی تاریخ اپنے آپ کو بدل بھی لیتی ہے۔''نوید سنجیدہ چہرے مگر شرارت آمیز لہجے میں کہتے بے بی باسینیٹ گھسیٹتا اندر چلا گیا۔

----------+---------+--------

## ~شام سے اک اونچی سیڑھیوں والے گھر کے آنگن میں

سوات کا موسم اچھا تھا۔ حسین، خوبصورت، دل لبھاتا سا۔ مقدّم اپنے دادا کے گھر کی بالکونی میں کھڑا تھا۔ ہاتھوں میں کیمرہ لیے نیچے باغ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نیچے مقدس چار سالہ مکرم کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ وہ پانی کے بلبلے پھلاتی جاتی اور وہ ان بلبلوں کو پکڑنے کی تگ ودو میں پیچھے بھاگتا جاتا تھا۔ مقدم نے یہ منظر کیمرے کی آنکھوں میں مقید کر لیا۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔

## چاند کو اترے دیکھا ہم نے، چاند بھی کیسا؟ پورا چاند

نیوی بلیو رنگ کے شلوار کرتے میں ملبوس نوید مطمئن، اور محبت پاش نظروں سے سامنے بشریٰ کو دیکھ رہا تھا۔ اُسی کے ہم رنگ لباس میں ملبوس ایک ہاتھ سے ولید کو ساتھ لگائے، دوسرے بازو میں اپنی بیٹی کو تھامی وہ پورے اعتماد سے مہمانوں سے بات کر رہی تھی۔ دوسری بیٹی نوید کی والدہ کی گود میں تھی، وہ اپنی دادی کی لاڈلی تھی۔ جزا کی شادی کے بعد سے اُسکی ماں، بشریٰ کو نوید کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ اور تیسری؟ تیسری اِس وقت اپنے باپ کے سینے سے لگی انگوٹھا چوستی اپنی پر شوق آنکھوں سے لائٹوں کو دیکھ رہی تھی۔ نوید نے جھک کر اُسکے گالوں کو چوما تو اُس نے خاصا برا منا کر اپنے باپ کو ننھی ننھی آنکھوں سے گھورا تھا۔ آج ولید کی سالگرہ تھی، یہ اہتمام اُسی خوشی میں تھا۔

## انشاؔجی ان چاہنے والی دیکھنے والی آنکھوں نے

ہسپتال کا وہ پرائیویٹ وارڈ اِس وقت نیلے رنگ کے غباروں اور بیلوں سے سجا تھا۔اِس سجاوٹ کے لیے عمر نے ہسپتال انتظامیہ سے خصوصی اجازت لی تھی۔

''یہ لو تمہارا بیٹا۔دیکھو کتنا پیارا ہے؟''عمارہ کے وارڈ میں منتقل ہونے کے بعد، عمر کی والدہ نے اُس نومولود کو اُسکی گود میں لا کر دیا تھا۔

''کتنا پیارا ہے!''اُس نے بچے کو پیار کرتے محبت سے کہا تھا۔

''کیا نام رکھو گی اسکا؟''انہوں نے پوچھا۔

''جو عمر رکھ دے۔''اُس نے پاس کھڑے عمر کو دیکھتے کہا جسکی گود میں عمائمہ سوئی ہوئی تھی۔

''خضر!خضر رکھیں گے اسکا نام۔''اُس نے کہا تھا۔

## ملکوں ملکوں شہروں شہروں کیسا کیسا دیکھا چاند؟

پناہ گاہ میں رونقیں،اپنے عروج پر تھیں۔بچوں نے سارے میں شور پھیلا رکھا تھا۔صرف وہ دونوں بالکل خاموش لان میں بیٹھے تھے۔

''جزا!''رضا نے اُسے پُکارا تو اُس نے خاموش نظریں اٹھا کر دیکھا۔

''اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔''اُس نے جزا کا ہاتھ تھامتے کہا۔

''میں مایوس نہیں ہوں۔پر ڈاکٹر نے جو کہا وہ تم نے سنا تو ہے۔''وہ آہستگی سے بولی۔ایسے جیسے شرمندہ ہو۔ایسے جیسے اولاد نہ ہونا اُسکا جرم ہو۔

''جزا!کیا ہو گیا ہے تمہیں؟یہ دیکھو!یہ اتنے سارے بچے،یہ چھوٹے چھوٹے فرشتے یہ ہمارے ہی تو ہیں۔اور اُسے دیکھو!''اُس نے ہاتھوں سے عائشہ جی کی جانب اشارہ کیا، جنکی گود میں وہ دس دن کی بچی تھی، جو انہیں چھے روز قبل ہی کسی نے لا کر دی تھی۔لانے والے کو وہ کچرا کنڈی سے ملی تھی، کتے اُسکو کاٹ بھی چکے تھے۔یہ پناہ گاہ کی سب سے کم عمر بچی تھی۔

''بتاؤ! کیا ہم بے اولاد ہیں؟''اُس نے محبت سے پوچھا تو جزا مسکرائی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

## ہر اک چاند کی اپنی دھج تھی ہر اک چاند کا اپنا روپ

کرسیوں پر مجمعے کے درمیان بیٹھے علی، فاطمہ اور نشمیہ زور و شور سے تالیاں بجا رہے تھے۔ جبکہ اپنے اسپورٹس ڈے پر بہترین کارکردگی دکھانے والے، سب سے کم عمر طالب علم کا ایوارڈ تھامے، احمد پُر جوش سا تھا۔ ایوارڈ وصول کرنے کے بعد وہ تیزی سے اپنی ماں کے پاس آیا۔

''امی! یہ دیکھیں میرا ایوارڈ، یہ آپکے لیے۔''اُس نے ٹرافی اپنی ماں کو دکھائی۔

''واہ بھئی! سارا دن پریکٹس کے نام پر ہمیں اپنے ساتھ کھلایا اور ٹرافی اور کریڈٹ، اپنی ماں کو۔''علی نے مصنوعی ناراضگی سے اُسے دیکھا تھا۔

''احمد! دیکھو ذرا کوئی جل رہا ہے۔''فاطمہ نے شرارت سے کہا۔

''بابا! آپ کے لیے میں ٹرافی لاؤں گی اگلی بار۔''نشمیہ نے فوراً اپنے باپ کو تسلی دی تو وہ مسکرایا۔

''میں کیوں جلوں گا بھئی؟ میرے پاس تو نشمیہ ہے۔''علی نے منہ چڑاتے کہا تو وہ ہنس دی۔

## لیکن ایسا روشن روشن، ہنستا، باتیں کرتا چاند؟

''قسم سے حسین! مجھے لگتا ہے تم ستر سال کی عمر میں بھی بڑے نہیں ہو گے۔''حور عین نے جھنجھلاتے ہوئے کہا تھا، جس کے شوہر نامدار نے ابھی ابھی اپنے کوٹ پر چائے گرا لی تھی۔ اور اب حور اُسے جلدی جلدی صاف کر کے خشک کر رہی تھی، ساتھ اُسے بے نقط سنا بھی رہی تھی۔ جسے کوئی فرق ہی نہیں پڑھ رہا تھا۔ حور کے بھائی کی آج شادی تھی اور یہ خاندان کی سب سے آخری شادی تھی۔

''مجھے کیا پتہ تھا کہ تمہارا بیٹا اُسی وقت اپنی ٹائیکوانڈو صلاحیت آزمائے گا اور چائے کی پیالی پر ہی وار کر دے گا؟''وہ بھی ڈھیٹ تھا۔

''وہ تو بچہ ہے، تم سے کس نے کہا تھا کہ کوٹ پہن کر چائے پیو؟ گھر سے نکلتے وقت پہن لیتے۔''وہ استری سے اُسے سوکھاتی ہوئی بولی۔

''ایک ذرا سا کام کیا کر دیا اتنی باتیں سنا رہی ہو۔ اسی لیے انسان کی چار بیویاں ہونی چاہئیں، ایک مصروف ہو تو وہ دوسری کے پاس، دوسری مصروف ہو تو تیسری، اور تیسری مصروف ہو تو۔۔۔'' اُسکے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے جب حور عین نے کوٹ سیدھا اُسکے منہ پر پھینکا۔

''جاگ جاؤ خواب سے۔۔۔'' وہ کہتی ہوئی باہر نکلی۔

''جل گئی حور عین۔۔۔'' وہ اُسے چڑاتا ہوا ہنس رہا تھا۔

----------+---------+--------

''رضا اور مقدّم کہاں رہ گئے ہیں آخر؟'' حسین نے سخت تپ کر پوچھا تھا۔

''مجھ سے تو رضا نے کہا تھا کہ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے ہی پہنچ جاتا ہوں۔'' موبائل پر رضا کو مسلسل کال ملاتے علی نے کہا تھا، اور وہ تھا کہ فون ہی نہیں اٹھا رہا تھا۔

''انسان تھوڑا صبر بھی کر ہی لیتا ہے۔'' سیاہ جینز پر سرمئی گول گلے والی جرسی پہنے اور اُس پر سرمئی رنگ کا کیجوال کوٹ ڈالے نوید نے کہا تھا۔ صبح نو بجے کی دھوپ اُسکے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ سردی بھی بڑھ چکی تھی۔

''کم از کم بندے کو فون تو اٹھانا چاہیے نا!'' علی نے خفگی سے کہا تو اُسی لمحے رضا کی گاڑی آکر رکی، اُس نے اندر سے ہی ہاتھ ہلایا پھر اُترا اور اُنکی طرف آیا۔

''چلو جلدی کرو! آڈیٹوریم میں آجاؤ!'' اُس نے آتے ساتھ ہی حکم دیا تھا۔

''مقدّم کو تو آنے دو۔'' عمر نے کہا تھا۔

''آجائے گا وہ بھی تم لوگ تو چلو، ورنہ جگہ نہیں ملنی پھر۔۔۔'' وہ کہتے ہوئے آڈیٹوریم کی جانب بڑھ چکا تھا۔ آج اُنکے بی بی اے کے بیچ کا ری یونین تھا۔

''اتنی جلدی ری یونین رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی تو فقط بارہ سال ہی ہوئے ہیں پاس آؤٹ (فارغ التحصیل) ہوئے، کم از کم بیس پچیس سال بعد رکھنا چاہیے تھا، مجھے تو اب تک تمام راستے یاد ہیں جامعہ کے۔'' آڈیٹوریم میں سب سے پیچھے اور سب سے اونچی جگہ پر بیٹھتے حسین نے کہا تھا۔

''بیس پچیس سال بعد نجانے دنیا رہے نہ رہے۔'' یہ ٹھنڈی آہ عمر نے بھری تھی، جو اِس لمحے کسی کو پسند نہ آئی تھی۔

''یہاں بیٹھ کر ہم نے کرنا کیا ہے؟'' یہ بے مقصد سوال ایس ایس پی صاحب نے کیا تھا۔

''انتظار کرو، ابھی سنگر آئیں گے تمھیں تمہاری پسند کا گانا سنایا جائے گا، کنسرٹ میں تو آئے ہو تم یہاں۔'' حسین نے کہا۔ نہیں! اُس نے طنز بالکل نہیں کیا تھا۔ نوید نے فقط گھورنے پر ہی اکتفا کیا۔

سامنے اسٹیج پر اُس بیچ کے تمام اساتذہ اور ایچ او ڈی موجود تھے۔ عوام میں بھی بہت سے جانے پہچانے چہرے نظر آرہے تھے۔ روسٹرم پر میزبان نے پروگرام شروع کیا تو اب کہ رضا نے فکرمندی سے یہاں وہاں دیکھا تھا۔

''یہ مقدّم کہاں رہ گیا ہے؟'' اُس نے عمر سے پوچھا۔

''یہی بات باہر بھی کہی تھی ہم نے۔'' حسین آج طنز کر کر کے مقدّم کی کمی پوری کر رہا تھا۔

''پر اب تو بہت دیر ہو چکی ہے۔'' وہ اُسکا فون ملا رہا تھا پر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ فون اُٹھا کر نہیں دے رہا تھا۔

میزبان نے اُسی بیچ کے استاد کو دعوت دی تو وہ روسٹرم پر آئے۔ سب کو سلام کرنے کے بعد اُنہوں نے اپنی تقریر شروع ہی کی تھی کہ آڈیٹوریم کا بالکل سامنے والا دروازہ کھلا، وہی دروازہ جہاں سے براہِ راست اسٹیج پر آیا جاتا تھا۔ اور وہ بھائی صاحب مقدّم شفیق تھے۔

''ارے! وہاں سے نہیں آنا تھا۔'' اُسے دیکھ کر سب سے پیچھے بیٹھے اُسکے دوستوں نے سر پیٹا تھا۔ روسٹرم پر کھڑے استاد سمیت پورے آڈیٹوریم نے اُسے ہی دیکھا تھا۔ جبکہ اُس نے زبان دانتوں تلے دبائی، بارہ سالوں میں کیا وہ آڈیٹوریم ہی بھول گیا؟

''سوری!'' وہ بری طرح شرمندہ ہوتا باہر جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ

''وائے اریولیٹ؟(آپ دیر سے کیوں آئے ہیں؟)''روسٹرم پر کھڑے پروفیسر کی کرخت آواز کانوں میں پڑی تو وہ حیرت سے پلٹا،پورا آڈیٹوریم سناٹا۔۔۔

''وہ۔۔۔میں۔۔۔''وہ گڑبڑایا۔

''اتنے سالوں میں بھی وقت پر آنا نہیں سیکھا تم نے؟''اُنکے لہجے میں کوئی فرق نہ آیا،البتہ آنکھوں میں شرارت ضرور واضح تھی۔مقدّم سمیت سارے مجمع کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''وہ راستے میں گاڑی۔۔۔'' وہ کوئی وضاحت دینے ہی لگا کہ

''پھر بہانے؟''استاد کی آواز پر مجمعے میں کھی کھی کی آواز ابھری،جبکہ مقدّم نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''گیٹ آؤٹ آف مائی کلاس۔۔۔''اب کہ سب زور سے ہنسے تھے۔جبکہ مقدّم واقعی دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

''ارے!یہ واقعی چلا گیا؟''استاد صاحب پریشان ہوئے،سب لوگ چہرہ اُٹھا اُٹھا کر دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

''کوئی اِسکو بلاؤ بھئی،میں تو مذاق کر رہا تھا۔''استاد صاحب نے رونے جیسا چہرہ بنایا تو وہاں قہقہ پڑا۔اسی اثنا میں پیچھے والا دروازہ کھلا اور مقدّم وہاں سے نمودار ہوا۔

''شکر!''استاد صاحب نے گہرا سانس بھرنے کی اداکاری کی۔پھر قہقہہ۔۔۔

''آئندہ لیٹ آئے تو پھر دیکھنا!''ایک مرتبہ پھر اُسے جھڑکا جو اُس نے سینے ہاتھ رکھ کر قبول کر لیا۔محفل کشت زعفران بن چکی تھی۔

ری یونین اچھا چلا،استاد صاحب نے کچھ پرانی باتیں و یادیں تازہ کی،کچھ پرانی تصاویر دکھائی گئیں۔سابقہ طلبہ و طالبات میں سے فقط رضا کو ہی روسٹرم پر بلایا گیا کہ وہ بھی وہاں پر اب استاد کی حیثیت رکھتا تھا۔

تقریب کے اختتام پر انھیں جامعہ گھومنے اور ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کا موقع دے دیا گیا۔جنوری کا مہینہ تھا،اور نئے سیشن کا آغاز ہو چکا تھا۔

جس جامعہ میں کبھی اُنکا پہلا دن تھا، آج وہاں پھر کسی کا پہلا دن تھا۔ نئے چہرے ہمیشہ کی طرح پریشان حال ہی تھے، پرانوں میں اب بھی شیطان کے چیلے موجود تھے، جو مدد کم اور پریشان زیادہ کر رہے تھے۔

''ارے حسین!'' وہ لوگ باغ میں کھڑے تھے، مقدّم کے کہنے پر تصویر لے رہے تھے، نوید تو مکمل بھاگنے کے موڈ میں تھا لیکن علی اور حسین نے اُسے روک رکھا تھا۔

''آپ؟'' حسین نے اپنے نام کی پکار پر آنے والے کو دیکھا تو فوری طور پر پہچان نہ سکا۔

''کیسے ہو حسین؟ کتنے عرصے بعد دیکھا تمہیں۔'' وہ بڑا خوش تھا۔ حسین نے دماغ پر زور ڈالا، چہرہ ذہن میں تھا پر یاد نہیں آ رہا تھا کہ کون ہے؟

''مجھے پہچانا؟'' حسین کو ہونق بنے دیکھ کر اُس نے خود ہی سوال کیا۔

''ہاں! تم شاید۔۔۔''

''تم مستقیم ہو نا!'' یہ آواز مقدّم کی تھی۔

''مستقیم؟'' حسین بڑبڑایا اور یکدم ہی اُسکے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''ارے! یہ وہی مستقیم ہے جسکی تم نے فاتحہ پڑھوا دی تھی۔'' اِس سے پہلے کہ حسین کچھ کہتا مقدّم نے اُسے یاد دلایا، اُس نے پلٹ کر کینہ توز نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔

''وہ میں نے جان کر نہیں کیا تھا۔'' حسین نے فوراً وضاحت دی۔

''جان کر ہی کیا تھا۔'' نوید نے سنجیدگی سے کہا تو وہ لوگ ہنسے۔ ایک سے بڑھ کر ایک خبیث دوست تھے اُسکے۔

''کوئی نہیں! میری کور میموری میں آج بھی وہ واقعہ تازہ ہے۔ میں یاد کر کے آج بھی ہنستا ہوں۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا تو حسین مطمئن ہوا۔

''اور آج کل کیا کر رہے ہو؟'' حسین نے پوچھا۔

''میں جنرل منیجر ہوں ایک فرم میں، اور نوید۔۔۔ تمہیں تو میں پہچان ہی نہیں سکا۔''اُس نے نوید کو دیکھتے کہا تو وہ بس ہلکے سے مسکرا دیا۔

اتنی دیر میں یہ سولہواں شخص تھا، جس نے نوید کے بارے میں یہ جملہ کہا تھا۔ پھر اُس نے کچھ بات چیت کے بعد سب کو دیکھا اور بولا۔

''مجھے یہ دیکھ کر اچھا لگا کہ تم سب بارہ سالوں سے ساتھ ہو۔ایسی دوستی کم ہی نصیب ہوتی ہے۔''اِس بات پر علی نے کان کھجاتے رضا کو دیکھا، اُس نے یہاں وہاں، عمر کو تو باقاعدہ کھانسی آئی تھی، جبکہ نوید نے گہری آہ بھر کے سر جھکا دیا۔ پھر چند ہی سیکنڈ گزرے، اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے، البتہ مستقیم اُنکے ہنسنے کی وجہ نہ سمجھ سکا۔

اسی طرح وہ مزید سابقہ اسٹوڈنٹس سے ملتے رہے، اُس دوران عمر کی نظر ایک مرد پر پڑی، اور اُسے فقط ایک سیکنڈ لگا تھا اُسے پہچاننے میں۔

''نواز؟''عمر نے دور کھڑے اُس بردبار سے لڑکے کو دیکھ کر کہا تھا۔

''ہاں! یہ وہی ہے شاید، پر یہاں کیا کر رہا ہے؟''نوید نے بھی اُسے دیکھ کر کہا۔

''نواز یہاں پر انگلش کمپلسری پڑھانے آتا ہے۔''رضا نے بتایا تو عمر نے خوشگوار حیرت سے دیکھا تھا۔ یہ وہی لڑکا تھا جو نابینا تھا، اور آج بھی وہ اسٹک کے سہارے ہی کھڑا تھا۔ لیکن اُس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر ڈالی تھیں۔

جامعہ آج بھی اپنے آنے والوں کو خوش آمدید کہتی تھی۔ سڑکیں بہتر ہو گئی تھیں، کچھ نئے ڈپارٹمنٹس کا اضافہ بھی ہوا تھا۔

''اگر تم بیس پچیس سال بعد بھی یہاں آتے تو پوائنٹس یہی والے ہوتے۔''رضا نے ٹرمنل میں کھڑے پوائنٹس کو دیکھ کر کہا تو نوید بیساختہ ہنسا۔

''چھے سال میں مجھے صرف سات آٹھ مرتبہ ہی پوائنٹ میں بیٹھنا نصیب ہوا ہوگا۔''نوید نے پوائنٹس کو دیکھتے کہا تو علی حیران ہوا۔

''تم تو پوائنٹ سے ہی آتے تھے۔''پیچھے کیمسٹری کینٹین میں بیٹھے طلبہ پر شوق نظروں سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔

''میں نے بیٹھنے کی بات کی ہے، آتا میں اُس میں کھڑے ہو کر تھا۔''اِس بات پر وہ لوگ ہنسے تھے۔

نئے چہرے آج بھی اپنے مستقبل کی فکر میں تھے، کچھ نئے دوست بنا رہے تھے، کچھ نئی زندگی۔۔۔

اور جو دوست بنا چکے تھے۔۔۔

وہ اُن میں اپنا ماضی تلاشتے مسکرا رہے تھے۔۔۔

کہ انکا سفر اب تمام ہوا تھا۔

----------+---------+--------

ہر کہانی کا ایک اختتام ہوتا ہے۔۔۔

پر ہر کردار کا اپنا اختتام ہوتا ہے۔۔۔

ضروری نہیں کہ کردار کا اختتام اور کہانی کا اختتام یکساں ہو۔

کہانی کا اختتام۔۔۔

ابھی باقی ہے۔

----------+---------+--------

**دو سال قبل:**

مورخہ نو جولائی

''اظہر نے تمام جرائم قبول کر لیے ہیں، پھر وہ اِس ایک نہ ہونے والا قتل کو کیوں قبول نہیں کرے گا؟ وہ ڈھیٹ شخص بڑے مزے سے ہمیں اپنے تمام قتل کی داستان سنا رہا ہے، تو وہ اِس بات پر انجان کیوں بنے گا؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''اگر بالفرض مان بھی لیں کہ وہی ان چھے لوگوں کے پیچھے تھا، تو پچھلے چھ ماہ سے ہم نے کسی کے بھی آس پاس کوئی مشکوک سرگرمی کیوں نہ دیکھی؟ مورخہ چھے کا جتنا خوف ہمارے دلوں میں تھا، اُس روز تو کچھ بھی نہ ہوا۔ فرح بھی فقط پُرانی دشمنی کی بنا پر اُس رات نوید کو قتل کرنے آئی تھی۔ اور جب نوید فرح کے قریبی آدمیوں میں شامل ہوا تھا، تو فرح نوید کو کیوں پہچان نہ پائی، جبکہ اظہر تو نوید کو قتل کرنا چاہتا تھا، اور وہ اظہر کے تمام جرائم کو اچھے سے جانتی تھی۔ اُسے تو فوراً نوید کو پہچان لینا چاہیے تھا؟ اور اگر اظہر ان سب کو جانتا تو وہ اتنے سال انتظار کیوں کرتا؟ جب یہ سب الگ تھے تو انہیں مارنا آسان تھا۔ اُس پر سے مزید بر آں یہ کہ وہ نوید کے بیٹے کو رضا کے پاس کیوں رکھواتا؟

اگر وہ واقعی اُن سب کا دشمن ہوتا تو وہ اپنے ایک دشمن کے بیٹے کو دوسرے کے پاس کیوں رکھوائے گا؟" اُنکے سوال پر سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُنکے ہاتھ ایک ڈور آئی تھی۔ اُلجھی ہوئی ڈور!

"ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی کھیل کھیلنا چاہتا ہو؟ سائیکو تو ہے وہ!۔۔۔"فیصل نے بھونڈی سی وضاحت پیش کی۔

"اتنا بیوقوفانہ کھیل؟" انہوں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "یہ سب سوچو تو بہت بیوقوفانہ لگتا ہے۔"

"یعنی؟" ساگر نے پوچھا۔

"یعنی۔۔۔" وہ آگے کو ہوئے۔ "اس تمام کہانی میں جھول ہے۔" انہوں نے آہستہ سے کہا تھا۔

"تو اگر یہ اظہر نے نہیں کیا، تو قوی امکانات ہیں کہ یہ مائیکل نے خود کیا ہوگا۔ لیکن مسئلہ یہی ہے کہ مائیکل کی ان سے کیا دشمنی تھی؟ یہ وہی بتا سکتا تھا۔" ساگر نے کہا۔

"اور اب وہ زندہ نہیں ہے۔"فیصل نے بات مکمل کی۔

"اور مجھے نہیں لگتا کہ اب اِس مسئلے کی گہرائی میں جانے کی ضرورت ہے۔ فرّخ صاحب کا کل آخری دن ہے، نئے آنے والے نے ایک ایسے کیس میں قطعاً وقت برباد نہیں کرنا، جس میں نہ کسی کا نقصان ہوا ہے، اور نہ ہی مجرم فرار ہے۔ بہت زیادہ بھی ہوا تو نیا ڈی آئی جی یہ مائیکل کے سر ڈال کر معاملہ ختم کر دے گا۔" ساگر کی بات سولہ آنے درست تھی۔

"ہاں! میں کل ریٹائر ہو جاؤں گا۔ اور میرے بعد کسی کو اِس معاملے میں دلچسپی نہیں ہو گی۔ لیکن۔۔۔" وہ رکے اور سب کو دیکھا۔ "یہ کام مائیکل نے نہیں، بلکہ ایف آئی اے میں ہی سے کسی نے کیا ہے۔ ڈائری ہم تک پہنچنے سے پہلے کسی ایسے شخص کے ہاتھوں میں گئی ہے، جس نے آخری صفحے پر اُن تصاویر کا اضافہ کیا۔" فرّخ صاحب نے کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ مائیکل کا بیگ میرے پاس آیا تھا، میں نے ہی اُسکی تلاشی لی تھی۔ اُس میں سے ڈائری چھپی ہوئی بھی پہلے مجھے ہی ملی تھی۔" شیراز نے سنجیدگی سے بتایا۔

"تم سے پہلے بیگ کس کے پاس گیا تھا؟" فرّخ صاحب نے پوچھا۔

''بیگ نوید سر کے پاس تھااور انہوں نے تلاشی لینے کے بعد میرے حوالے کر دیا کہ بیگ میں کچھ نہیں ہے، پھر میں نے۔۔۔'' یہاں تک بتاتے بتاتے وہ یکدم ہی رک گیا، اور اُسکی آنکھیں جیسے تحیر سے واہو گئیں۔

''ایسا۔۔۔ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''اُس نے فرخ صاحب کو حیرت سے دیکھا۔

''ہاں! میرا ابھی یہی سوال ہے کہ ایسا کیسے ہو سکتا؟ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو ڈائری تم نے ڈھونڈلی، وہ نوید عالم نہ ڈھونڈ سکا؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ وہ اتنا نالائق ہے؟'' یہ سوال نہیں تھا، دس ہزار کلو کا بم تھا، جو اُنکے سروں پر پھٹ چکا تھا۔

----------+---------+--------

پرانے آرٹسٹک فرنیچر سے سجا کمرہ اِس وقت نیم اندھیرے میں تھا۔ دائیں طرف کی دیوار مختلف قسم کے اسلحوں سے مزین تھی۔ کمرے کی دوسری جانب کھڑکی کے پردے گرے ہوئے تھے، کھڑکی سے منسلک میز پر کچھ پرانے کاغذ اور ایک لال کور والی ڈائری کھلی پڑی تھی۔ کرسی پر بیٹھا وجود، ڈائری پر جھکا، کمرے کے نیم اندھیرے میں گم ہو رہا تھا۔ میز پر جلتی اسٹڈی بلب کی ہلکی پیلی روشنی میں اُسکا وجود فقط سائے کی مانند نظر آتا تھا۔ سارے کمرے میں روشنی صرف اُسی جگہ تھی، جہاں وہ بلب روشن تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر قلم اٹھایا اور ڈائری کے صفحے پر کچھ لکھنے لگا۔ پیلی روشنی میں اُسکا لکھا گیا جملہ نیم واضح سا ہوا۔

''میں ڈائری نہیں لکھتا۔ یہ وہ جملہ تھا جو میں نے اُس وقت بھی دہرایا تھا، جب میرج کاؤنسلنگ کے تھراپسٹ نے مجھے ڈائری دی تھی۔ اور میں نے اُس ڈائری کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ پر جو میں نے اب کیا ہے، اُس نے مجھے لکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چھ تصاویر، وہ چھ لڑکے، وہ جو کبھی دوست تھے، جنہیں میں نے یہیں بیٹھ کر، آخری صفحے پر جمع کیا تھا، اسی ڈائری کے آخری صفحے پر، اُس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ پر میں نے وہ تصویریں اپنے پاس جمع رکھیں تھی، ہمیشہ۔ پھر وہ تصویریں، میری ڈائری سے، اُس مائیکل کی ڈائری کے آخری صفحے پر منتقل ہو گئیں۔ وہ آخری صفحہ جس نے سی ٹی ڈی والوں کے وجود میں سنسنی دوڑا دی ہے۔ جب ہی تو سب کے سب کو اکھٹا کر لیا۔ سب کے سب۔۔۔ نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔۔'' سایہ ہوتا وجود مسکرایا، اُسکی مسکراہٹ دلفریب تھی۔

''جس لمحے میرے ہاتھ میں مائیکل کی ڈائری آئی اسی لمحے میرے دماغ نے ساری کہانی لکھ لی تھی۔ اب اُس کہانی کو مجسم کرنا میرا کام تھا۔ ہاں! میں تو لکھنا بھول گیا۔ مجھے کہانیاں لکھنے کا بہت شوق ہے۔ بچپن سے۔۔۔

میں کہانیاں صرف لکھتا نہیں تھا، بلکہ اُن میں جیتا تھا۔ میں اپنے ذہن میں مختلف منظر نامے تخلیق کرتا، پھر اُن میں اتنا گم ہو جاتا کہ خود کو اُسکا حصّہ سمجھنے لگتا۔ وہ میری من پسند جگہ ہوتی تھی، وہاں وہ سب کچھ ہوتا تھا، جو میری زندگی میں نہیں ہو سکا۔ میری تمام محرومی میرے اُن منظر ناموں میں مکمل ہو جایا کرتی تھیں۔ میرے گھر والے میرا مذاق اڑاتے، مجھے ڈانٹتے اور ایک دن انہوں نے میری کہانی لکھنے پر پابندی عائد کر دی۔ پر میرے دل سے یہ شوق ختم نہ ہوا۔ تھراپسٹ نے مجھے کہا تھا کہ میری کچھ نفسیاتی الجھنیں ہیں، جنکا سلجھانا بہت ضروری ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر مجھے منظر نامے تخلیق کرنے کا شوق ہے، تو میں اُسے لکھنا شروع کر دوں۔ تا کہ اِس بوجھ سے آزاد ہو جاؤں۔

اور میں نے لکھ لیا۔

میں نے اپنی محرومی پر پہلی کہانی لکھ لی۔

میری محرومی۔۔۔ میرے دوست۔۔۔

میری کہانی کے پانچ کردار۔۔۔۔

اور چھٹا میں۔۔۔"

وہ تھوڑا آگے کو ہوا تو پیلی روشنی نے اُسکا چہرہ مکمل روشن کر دیا۔ اُسکا نیم واضح چہرہ اب مکمل واضح تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے لکھ رہا تھا۔

"یہ کہانی میری تھی۔۔۔

میں یعنی ایس ایس پی نوید عالم !"

--------+---------+----------

آدمی کی زندگی کا سب سے خطرناک مسئلہ ایک ہی ہے۔

گلٹ۔۔۔۔

ایس ایس پی نوید عالم پچھلے کئی سالوں سے اپنے دوستوں کی تصویریں اپنے سامان میں رکھ کر گھومتا تھا۔ اُسکے لیے وہ اُسکی فیملی تھے، اُسکے پہلے اور آخری دوست۔۔۔

وہ اظہار کے معاملے میں نابلد تھا، اُسے کہنا نہیں آتا تھا۔ وہ کبھی کہہ نہیں پایا کہ اُسکا دل کا قدر پچھتاوٗں میں جلتا ہے۔ اس لگتا تھا کہ صنوبر کے بعد ہونے والے جھگڑے میں تمام کردار صرف اور صرف اُسکا تھا۔ عمر کا چلے جانا، یا مقدّم فرار ہو جاتا، اصل مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ اصل مسئلہ نوید کا پیچھے ہٹنا تھا۔ اُسکا پیچھے ہٹنا ہی تھا، جس نے علی کو ٹریگر کیا تھا۔ یہ وہی تھا جس کی بزدلی نے انکی دوستی کو تباہ کیا تھا۔ اور اِس بات کا پچھتاوا اُسے ہمیشہ سے تھا۔ لیکن وہی بات۔۔۔ وہ اظہار کے معاملے میں نابلد تھا۔

وہ کئی سالوں سے اِس منظر نامے میں جی رہا تھا کہ ایک روز اُسکے تمام دوست اکھٹے ہو گئے۔۔۔۔

اپنی ناراضگیاں ختم کر لیں۔۔۔

اور اُس سے ملنے آ گئے۔۔۔ سب بھلا کر۔۔۔

اور یہ صرف منظر نامہ تھا۔ جسے اُسکا دماغ ہر دوسرے روز تخلیق کر لیتا۔ پر اُسکا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

جس روز مائیکل کا سامان اُنکے ہاتھ لگا، اُس روز اکیلے کمرے میں اُسکے بیگ کی تلاشی لیتے ہوئے، اُسے احساس ہوا کہ بیگ خالی نہیں ہے۔ اُس نے سکینڈ کے ہزارویں حصے میں وہ جگہ ڈھونڈ لی، جہاں سے اُس خفیہ جگہ تک پہنچا جا سکتا تھا۔ وہاں اُسے مائیکل کی ڈائری ملی۔ اُسکے ہر صفحے سے معلوم ہوتا تھا کہ مائیکل ایک سیریل کلر ہے۔ لیکن آخری دو صفحے خالی تھے۔

اُسے نہیں معلوم کہ اُس سے قبل اُسکے ذہن نے کام کیوں نہ کیا؟ پر اس روز اُسکے تخلیق کار ذہن نے ایک اور منظر نامہ ترتیب دیا۔ ایک ایسا منظر نامہ جس میں اُسکے سارے دوست اکھٹے ہو گئے، کسی مشکل وقت میں پھر سے ساتھ ہو گئے۔ پہلے وہ سوچتا تھا کہ وہ مر جائے، یا موت کے منہ میں چلا جائے اور اُسکے دوست اُسکی موت پر اکھٹے ہو جائیں۔ پر ایسا نہ ہوا، موت کے منہ سے کئی بار واپس آنے کے بعد موت اُسکے لیے دلچسپ نہ رہی تھی۔

مائیکل کی ڈائری کا آخری صفحہ دیکھ کر، اُس نے وہ منظر سوچ لیا، جب اُسکے تمام دوست یہاں اکھٹے ہوں گے۔ ہاں پر اُس سے آگے اس اُس کچھ نہ سوچا۔۔۔ کچھ بھی نہ۔۔۔

اُس نے اپنے سامان میں رکھی وہ تصویریں نکالی اور آخری صفحے پر چسپاں کر دیں، وہ تلاشی لیتے ہوئے دستانے پہنے ہوئے تھا، اُسے انگلیوں کے نشانات کا کوئی ڈر نہ تھا۔ اُن پرانی تصویریں کو وہاں لگانے کے بعد، اُس نے ایک تاریخ سوچی، دو ماہ بعد کی۔ اور نہیں! دل نے تردید کر دی، اُسے لمبا وقت چاہیے تھا۔ اِتنا وقت کہ اسکے دوست پھر سے دوست بن جائیں۔

پھر اُس نے سال کے چھٹے مہینے کو چنا ، مہینہ چھٹا چنا تو تاریخ بھی چھے ہی چنی۔ مائیکل کی لکھائی کی بہترین نقل اُتار کر، اُس نے ڈائری کو واپس اُسکی جگہ پر رکھ دیا۔ اور کچھ دیر بعد شیراز کو بلا کر بیگ اُسکے حوالے کرتے یہ ظاہر کیا کہ بیگ خالی ہے، اور وہ جانتا تھا کہ شیراز فوراً جان لے گا کہ بیگ میں کچھ ہے۔ وہ اور بات ہے کہ وہ اُسکی طرح اصل مقام سے ڈائری باہر نہیں نکالے گا، وہ بیگ کو پھاڑ کر اُس میں سے مطلوبہ سامان نکالے گا۔ اور وہی ہوا۔

جب وہ بیگ لے کر آیا تو نوید نے اُسے اتنا خوش ہو کر شاباشی دی، جیسے وہ واقعی ڈائری نہ ڈھونڈ سکا ہو۔ بیچارہ شیراز!

اور پھر ہر شے اُسکی مرضی کے مطابق ہوئی، ایف آئی اے نے کیس اُسکے حوالے کیا، اور اُسکے دوستوں کو اکھٹا کرنے کا عندیہ دے دیا۔ وہ کام جو وہ خود نہ کر سکا، اب ایف آئی اے کے ذریعے ہو رہا تھا۔ وہ خوش تھا، پُر جوش بھی، اور انکا منتظر بھی۔ پر اُسے اپنے چہرے سے یہ ظاہر نہیں کرنا تھا، اُسے ایسے ہی رہنا تھا جیسے یہ ملاقات اتفاقیہ ہو۔

ہر شے یہاں تک تو ٹھیک تھی، لیکن وہ جانتا تھا، جس روز مائیکل پکڑا گیا، اُس دن یہ حقیقت سامنے آجائے گی۔

لیکن اسکا حل بھی اُس نے سوچ لیا تھا۔

مائیکل کے پکڑے جانے کے بعد تفتیش کے لیے اُسے یقیناً نوید کے پاس ہی لایا جاتا، وہ اُس سے اُسکے مالک کا نام اُگلوا کر اُسکا قصّہ تمام کر دیتا۔ وہ مر بھی جاتا تو کسی کو کیا فرق پڑنا تھا؟ وہ تو ویسے بھی ایک مہرہ تھا۔ اور نوید اُسے بظاہر اپنے دفاع میں مارنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ وہ تمام انتظام کر چکا تھا مگر۔۔۔

قسمت اُسکے کھیل میں اُسکا بھرپور ساتھ دیناچاہتی تھی۔

--------+---------+----------

وہ کہتے تھے کہ وہ نوید عالم کو کبھی نہ جان سکے۔ پر وہ یہ نہیں جان سکے کہ نوید عالم اپنے دوستوں کو اُنکے سایوں سے بھی زیادہ گہرائی سے جانتا تھا۔

اُسے بہت اچھے سے معلوم تھا کہ پہلی ملاقات کیسی ہوگی؟ اُنکے یہاں آنے سے قبل اُسے ہر ایک کی گزشتہ زندگی کی تمام معلومات مل چکی تھیں۔ اُس نے اُنکے یہاں آنے سے قبل اُنکا دکھ منا لیا تھا۔ عمر کی بیماری سے لے کر علی کی طلاق تک، اور لیلیٰ کی موت سے لے کر رضا کے نشہ کرنے تک، اُسے سارے غم ایک ساتھ جاننے کو ملے تھے، اور اُس نے برداشت بھی کر لیے تھے کہ وہ اُس سے بڑا غم سہہ کر آیا تھا۔ ایک بات تو وہ جان گیا تھا کہ پہلی ملاقات میں سوائے اجنبیت کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اور وہی ہوا، لہٰذا اُس نے بھی اجنبیت کا خول خود پر چڑھائے رکھا۔ البتہ یہ ایک دفاع بھی تھا۔ جو وہ اُنکے بارے میں جان چکا تھا، فوری طور پر اُن سے سامنا کرنا آسان نہ تھا۔ فرخ صاحب کے اُنہیں بریف کرنے کے بعد اُنکے چہروں پر جو پریشانی آئی تھی، وہ دیکھ کر اُسے کچھ دیر کے لیے شرمندگی ضروری ہوئی تھی۔ پر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ کچھ برا حقیقت میں تو ہونے نہیں والا ہے۔

اگلے ملاقات سے قبل اُنکے پیچھے ایف آئی اے نے اپنے بندے لگا دیے تھے۔ حالانکہ اِسکی ضرورت نہیں تھی، پر نوید اِس کام سے اُنہیں روک بھی نہ سکتا تھا۔ البتہ ایک فائدہ ضرور ہوا، وہ یہ کہ اُسے اُنکی پل پل کی معلومات ملنے لگی تھیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سب سے پہلے جو دو لوگ دیوار گرنے کی کوشش کریں گے وہ عمر اور مقدّم ہوں گے، کیونکہ اُن دونوں کا جھگڑے سے براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اُسکا اندازہ صحیح نکلا۔

دوسرا انتظار اُسے حسین کا تھا، وہ جانتا تھا کہ حسین سب سے پہلے جس شخص سے ملنا چاہے گا، وہ رضا ہوگا۔ باوجود اِسکے کہ پہلے بھی دونوں اسی شہر میں تھے، لیکن ملنے پر آمادہ کرنے کہ لیے ایک ضرب کی ضرورت تھی اور وہ نوید نے لگای تھی۔ اور اُسے یہ بھی یقین تھا کہ اب وہی ہوگا جیسا وہ سوچ رہا تھا۔

آخر میں جو شخص اکیلا رہ جاتا وہ علی تھا، اور علی کے لیے وہ کافی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ علی جتنا سب سے ناراض ہے، اور جتنا سب اُس سے بدگمان ہیں، اُس کے لیے کوئی پہل نہیں کرے گا۔ لیکن اِس سے قبل کچھ ایسا ہوا، جس نے نوید کو وقت سے قبل ہی علی سے مخاطب ہونے پر مجبور کر دیا۔

اُس روز وہ واپس جا رہا تھا، جب اُسے راستے میں علی ملا تھا۔ یہ ملاقات بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی اُسکے پاس رکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ علی پریشان نظر آرہا تھا، اتنا کہ اُس نے نوید کے آنے کا نوٹس بھی نہ لیا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو اتنی رات کو؟'' وہ بیساختہ ہی اُس سے پوچھ بیٹھا۔ پر علی کے، اجنبی نظروں سے دیکھنے پر، اُسے احساس ہوا کہ اُسے اتنی جلدی اپنے خول سے باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔

''میرا مطلب تمہیں احتیاط کرنی چاہیے، تمہاری جان کو خطرہ ہے۔'' اُسے فوری طور پر سمجھ نہ آیا کہ کیا وضاحت دے۔ یہ پہلی غلطی تھی جو اُس سے ہوئی تھی۔

پر جب علی نے جواب نہ دیا تو وہ جانے کے لیے پلٹ گیا کہ شاید وہ ابھی بات کرنے کا روادار نہیں ہے۔ پر علی نے اُسے آواز دی، وہ پلٹا اور اُسے دیکھا۔ پھر جو باتیں اُس نے کہیں۔ نوید کے لیے وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ بھی اُسے آگے سے دو چار طنزیہ باتیں سنا کر جانے لگا، پر قدم جانے سے انکاری ہو گئے۔ علی شکل سے پریشان نظر آرہا تھا۔ اُسکی ذاتی زندگی کی اطلاع نوید کو مل چکی تھی۔ اُس رات وہ اُسے وہاں چھوڑ کر نہیں جا سکا۔ اُسے واپس آنا پڑا، صرف اُسکی خاطر۔

لیکن۔۔۔۔

اُسکے بعد جو علی نے کہا، وہ اُسکے لیے مزید شرمندگی کا باعث تھا۔ علی کے الفاظ سے لگتا تھا جیسے وہ خود کو قصوروار سمجھتا ہے۔ اور نوید نہیں چاہتا تھا کہ وہ خود کو مزید قصوروار ٹھہرائے، مزید براں نوید عالم تو غلطی کا اعتراف بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اظہار کے معاملے میں نابلد تھا۔ لہٰذا اُس نے وہاں سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ گھر آیا تو اطلاع ملی کہ بشریٰ نے پھر سے قبرستان جانا شروع کر دیا ہے۔ وہ یا تو اپنے دوستوں کو ملاتا اور اپنی غلطی سدھارتا یا بشریٰ کو توجہ دیتا۔ اور بشریٰ اُسکے لیے زندگی کے ہر معاملے میں سب سے اوپر تھی۔ لہٰذا اُس نے پہلے پہل بشریٰ کو متنبہ کیا۔ فرح ویسے بھی آزاد گھوم رہی تھی۔ وہ کبھی بھی کچھ بھی کر سکتی تھی۔

اُسی صبح اُسے اطلاع ملی کہ حسین پاکستان آ گیا ہے اور اِس وقت اپنی بیوی کے ساتھ مارٹ میں موجود ہے۔ وہ جان کر اُسی مارٹ پہنچا تا کہ حسین کو ایک نظر دیکھ سکے۔ اُسکی خوش باش زندگی دیکھ کر نوید کے ارادے کچھ دیر کے لیے ڈگمگا گئے۔ جب حسین کو ایف آئی اے کی جانب سے اطلاع ملتی تب وہ کتنا پریشان ہوتا؟ کیا وہ غلط کر رہا تھا؟ کیا وہ اُسکی خوشی چھیننے کا باعث بن رہا تھا؟ اِس سے قبل کہ وہ اپنا ارادہ بدل لیتا، اُس نے وہاں سے نکل جانا ہی ضروری سمجھا۔

دوسری بار اُسے اپنے خول سے تب باہر آنا پڑا، جب علی اور رضا کا معاملہ گڑبڑ ہوا۔ اُن دونوں کے درمیان جو جھگڑا ہوا، اُس پر نوید کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ تو سمجھے بیٹھا تھا کہ ہر شے اُسکے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن یہاں فرّخ صاحب نے اُسکے علم میں لائے بنا ہی رضا کو خلیل سے ملنے بھیج دیا تھا۔ اور اُس پر مزید حیرت اِس بات پر تھی کہ علی تک رضا کی معلومات کیسے پہنچی؟

وہ معاملے کو سلجھانے کے لیے اتنا بڑا اقدم اٹھا چکا تھا، لیکن علی نے معاملہ پھر خراب کر دیا تھا۔ دل ہی دل میں اِس صورتحال پر سخت پریشان نوید، علی سے بات کرنا چاہتا تھا، رضا سے معذرت بھی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن قسمت شاید کسی اور طریقے سے اُنہیں ملوانا چاہتی تھی۔ اُسی روز شرپسند عناصر کے اتفاقیہ ہونے والے حملے میں وہ معمولی زخمی ہو گیا۔ اور وہ جو چاہتا تھا کہ اُسکے دوست اُسکی موت پر اکھٹے ہوں، اُسکا یہ شوق اُس روز پورا ہو گیا۔ سوائے علی کے وہ چاروں آئے تھے۔ صرف اُسکے لیے، وہ دل ہی دل میں خوش تھا۔ البتہ حسین کا اُسکے ساتھ کھنچا کھنچا رویہ اُسکی نظروں سے اوجھل بھی نہ تھا۔ پر وہی بات۔۔۔ اظہار ضروری نہ سمجھا۔

وہ اظہار سے ڈرتا تھا۔۔۔

اُسکے دل کا یہ خوف کہ اظہار کرنے پر اُسے ہمیشہ مذاق کا نشانہ بنایا جائے گا، یہ آج بھی پہلے دن کی طرح دل میں موجود تھا۔

پھر چیزیں اپنے آپ جگہ پر آنے لگیں۔ اگلی ملاقات سے پہلے اُسے اطلاع ملی کہ رضا اور علی کا اپنے محلّے میں بھی کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے، غالباً رضا اپنے ماموں کو گھر سے نکال رہا تھا۔ وہ اُسی روز جان گیا کہ علی اب تک رضا کے لگائے الزامات کو بھول نہیں پایا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کا ایک دوسرے سے لڑنا ضروری ہے، شاید لڑ لڑ کر ہی دونوں تھک جائیں، اور ٹھیک ہو جائیں۔ لیکن ایک بار پھر اُسکی توقع کے برخلاف علی نے رضا سے معافی مانگ لی، وہ بھی سب کے سامنے، اور رضا نے جواباً اُسے کھری کھری سنا دی۔ نوید اُس روز خاموش رہا کیونکہ وہ جان گیا

تھا کہ اِسکے بعد دونوں کے دلوں سے کدورت کچھ حد تک ختم ہو جائے گی۔ وہ جانتا تھا کہ اِسکے بعد رضا کو بھی احساس ہو گا کہ اُس نے غلط کیا۔ لیکن کوئی بات نہیں! جن کے تعلقات زیادہ خراب ہوں، وہ ٹھیک ہونے میں اتنا ہی وقت لیتے ہیں۔

اُس روز مقدّم نے پہلی بار لیلیٰ کی موت کا ذکر کر دیا، در حقیقت، اُسکا مقصد صرف اور صرف علی کے دل سے یہ خیال نکالنا تھا کہ وہ سب اسے تنہا چھوڑ گئے تھے۔ مقدّم کی کوشش اور کوئی سمجھا نہ سمجھا پر نوید سمجھ گیا تھا۔ اُسکے بعد علی وہاں اکیلا رہ گیا، وہ جانتا تھا کہ حسین رضا کے پیچھے جائیگا اور عمر مقدم کے۔ تو جس شخص کو اُس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، وہ علی تھا۔ لہٰذا اُس روز نوید کو ایک مرتبہ پھر اپنے خول سے باہر آنا پڑا۔ اُس روز، اُس نے علی کو بات کرنے کا موقع دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو علی اُس وقت جس قسم کے حالات کا سامنا کر رہا تھا، وہ یقیناً اپنے ساتھ کچھ غلط کر لیتا۔ پہلی بار نوید کو ایسا محسوس ہوا، جیسے اُن میں سے کسی کو بھی علی کا احساس نہیں ہے۔ وہ دوست ہوتے ہوئے بھی اکیلا تھا۔

اِس واقعہ کے اگلے روز بھی اُسے علی کی ہی فکر تھی، وہ اُسکے گھر پہنچا تو اطلاع ملی کہ علی کی بیٹی کو اُسکی سابقہ بیوی نے واپس کر دیا ہے۔ وہ تو جذباتیت میں اُسے یتیم خانے چھوڑنے کی بات کر رہا تھا لیکن نوید کو یہ شک تھا کہ وہ علی کی ہی بیٹی ہے۔ وہ اُسے اپنے طریقے سے سمجھا کر واپس تو آ گیا، مگر قسمت کے اِس طرح ساتھ دینے پر مسکرایا ضرور تھا۔

اُسی رات اُسے معلوم ہوا کہ پولیس جزا کو گرفتار کرنے آئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ہونے والا ہے، چاہتا تو پہلے پولیس کو متنبہ کر دیتا، پر یہاں اُس نے جان کر دیر کی۔ اُسے بہت پہلے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جزا، پناہ گاہ اور رضا کے ہی اسکول میں نوکری کر رہی ہے، گو کہ اُسے اِس بات پر اعتراض نہ تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ رضا کو یہ بات معلوم رہے کہ جزا اُسکی بہن ہے۔ لہٰذا جب پولیس اُسکو گرفتار کرنے پہنچی تو وہ پناہ گاہ میں ہی تھی، یہ دیکھ کر البتہ اُسے جھٹکا ضرور لگا تھا کہ حسین، عمر اور مقدم وہاں پہلے سے موجود تھے۔

اگر چیزیں بہتر ہونے لگی تھیں، تو پھر اُسے پلین بی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مائیکل کو گرفتار کرتا، اور وہی کرتا جو اُس نے سوچا تھا۔ لیکن۔۔۔

قسمت کچھ اور چاہتی تھی۔۔۔

اس نے کہانی بنی، اور قسمت نے اُس کی پروف ریڈنگ شروع کر دی۔

مائیکل اُسکی آمد سے پہلے مارا گیا تھا۔ یقیناً اُسکے گروہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ مائیکل بے نقاب ہو چکا ہے۔ اب ہر صورت ایف آئی اے پلین بی پر عمل کرنے والی تھی۔

پلین بی۔۔۔

جو اُسی نے بنایا تھا۔۔۔

وہ جانتا تھا کہ اُسکے دوست ایک ساتھ کچھ وقت ہی گزار لیں گے، تو آپس کے مسائل خود ہی حل کر لیں گے۔ اِس لیے اُس نے یہ منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ لیکن درمیان میں بشریٰ کو سب یاد آ گیا، اور نہ صرف یہ بلکہ اُسکے دوستوں کے معاملات بھی بہتر ہونے لگے تھے۔ اُس پر سے فرح نے بیچ میں اُس پر حملہ کروا دیا تھا، فقط دھمکانے کے لیے۔ وہ بشریٰ کی طرف سے اور زیادہ فکر مند ہو گیا تھا۔ ایسے میں اپنا بنایا پلین بی اُسے غیر ضروری لگنے لگا تھا۔ اسی دوران علی نے اُسے عدالت میں دیکھ لیا، وہ جانتا تھا کہ علی اب اُسے کریدنے کی کوشش کرے گا۔

اور وہی ہوا۔۔۔

نوید کو اُس روز بہت غصّہ تھا۔ اِس بات پر نہیں کہ علی نے اُسکی جاسوسی کیوں کی؟ بلکہ اِس بات پر کہ اُسکے دوست آج تک اُسے سمجھے کیوں نہیں؟ وہ کیوں نہیں سمجھتے کہ نوید اظہار نہیں کر سکتا، وہ توجہ کا مرکز بننا پسند نہیں کرتا، وہ ڈرتا ہے۔ وہ آج بھی ڈرتا ہے۔ عزت نفس مجروح ہونے سے، مذاق کا نشانہ بننے سے۔ اُسکے دوست اُسے خود سے کیوں نہیں پڑھ لیتے؟ خود کیوں نہیں سمجھ لیتے؟ حسین سب کا سوچتا ہے پر نوید کا کیوں نہیں؟ اُس روز وہ یقیناً علی کے آگے پھٹ پڑتا لیکن، جب علی نے اُس سے کہا کہ میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں تو لمحوں کے لیے وہ ساکت رہ گیا۔ وہ بیساختہ پوچھ بیٹھا کہ علی اُسکے اور صنوبر کے بارے میں کیسے جانتا تھا؟ بلکہ وہ سب ہی کیسے جانتے تھے؟ تب علی کے انکشافات نے اُسے اپنی سوچ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اُسکے دوست اُسے جانتے تھے، بلکہ اندر تک پڑھ لیتے تھے۔ بس خاموش رہتے تھے کہ نوید کی انا کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اُس روز۔۔۔ پہلی بار اُسے اپنے دوستوں کی قدر ہوئی۔

پھر رضا کا خودکشی کے لیے نکل جانا تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا تھا۔ اُس روز بھی اُس نے ایک غلطی کر دی تھی، جب ریسکیو ور کرنے رضا کی تصویر مانگی تو اِس نے اپنی جیب میں رکھی تصویر ہی اُسکے حوالے کر دی۔ اور یہی اُسکی غلطی تھی، اگر اِس وقت کسی کا بھی دماغ کام کر رہا ہوتا تو وہ مشکوک ضرور ہوتا کہ نوید اُنکی تصویریں ساتھ کیوں رکھ کر گھومتا ہے؟

رضا واپس آ گیا اور چیزیں اپنی جگہ پر آنے لگ گئی اور جب بشریٰ نے بھی اُسے معاف کر دیا تو یکدم ہی ایف آئی اے نے پلین بی پر عمل کرنے کو کہہ دیا۔ پہلی بار اُسے اپنے کسی فیصلے پر پچھتاوا ہوا۔ وہ اِس طرح بشریٰ کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اب قسمت ایسا چاہتی تھی۔ جانے سے قبل اُس پر انکشاف ہوا کہ جزا اور رضا ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔ گو کہ یہ قبل از وقت تھا اور اُسکی تصدیق بھی نہ ہوئی تھی، لیکن اُسکی زیرک آنکھوں نے یہ جان لیا تھا۔ اُسے اعتراض کوئی نہ تھا، لیکن ایک بھائی ہونے کے ناطے، اُسے اِس طرح جزا کا رضا کے ساتھ ملنا جلنا پسند نہ آیا۔ لہٰذا اُس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں دونوں پر واضح ضرور کر دیا کہ وہ یہ جانتا ہے۔ اُسکے بعد اگر رضا چاہتا تو اصولی طریقے سے اُسکا ہاتھ مانگنے آ سکتا تھا۔

پھر جو کچھ ہوا وہ اُسکے ہاتھوں سے باہر نکل چکا تھا۔ اب جو ہو رہا تھا وہ قسمت کی مرضی تھی۔ پر ہاں! اچانک ہی اُسے ان سب میں مزہ آنے لگا تھا۔ وہ اُنکے سامنے تھا اور کوئی اُس تک پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ یہ کھیل اُسے مزا دینے لگا، اپنی عقل کا وہ خود پرستار ہونے لگا۔

جب چلم کے لیے جیپ بک کرواتے ہوئے، مقدّم نے اُس سے کہا کہ وہ اُنہیں مارنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ ہنسا تھا۔ اگر جو مقدم کو معلوم ہو جاتا کہ وہی ہے جو اُنکی تصویروں کو جمع کر رہا تھا تو اسکا ردعمل کیا ہو گا؟

حویلی آنے کے بعد اُس نے حسین کو اپنے ساتھ رکھنا بہتر سمجھا، ویسے بھی حسین اُس سے کچھ زیادہ ہی متنفر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ حسین سے معذرت کرے، لیکن سب کے سامنے نہیں۔ اِس لیے اُس کو اپنے ساتھ رکھا۔ لیکن جب حسین نے بار بار اگاتھا کرسٹی کے ناول کو استعاراً استعمال کرنا شروع کیا، تو اُسکے دل کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا، کہ کہیں اُسے نوید پر شک نہ ہو گیا ہو۔ حالانکہ جب ایف آئی اے کو اِس اُس شک نہ ہوا تو حسین کیا شے تھا؟ لیکن اُس نے محتاط ہو جانا ضروری سمجھا۔ حسین کو منانے کی بجائے، اُس نے اُسے مزید اپنے آپ سے متنفر کر دیا، جب وہ بنا بتائے مقدم کے ساتھ باہر گیا تھا۔ اِس طرح حسین نے اُسکے معمولات میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ بعد میں اُس نے اُس سے معذرت کر لی۔ حویلی آ کر جو بات اُسے بہت پسند آئی، وہ یہی تھی کہ اُسکے دوست اب اُسکے بارے میں سوچ رہے تھے، البتہ وہ اُس سے بات کرنے سے ڈرتے تھے۔ نجانے کیوں؟

نوید کو کہانیاں لکھنے کے بعد جو دوسرا شوق تھا، وہ تھا توجہ کا۔ہاں! وہی توجہ جو اُسکا دم گھٹاتی تھی، وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اُسے دیکھیں، لیکن وہ چاہتا تھا کہ اسکے آس پاس والے، بس اُسی کے بارے میں سوچیں اور وہ اِس میں کامیاب ہو رہا تھا۔حویلی کے آخری دنوں میں اُسے احساس ہوا کہ اُسے اب اپنے خول کو توڑ دینا چاہیے، اپنے دوستوں کے ساتھ گھل مل جانا چاہیے لیکن۔۔۔

قسمت کچھ اور بھی جانتی تھی۔قسمت نے اُسے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ میں سمٹنے اور مجبور کر دیا۔اور اِس مرتبہ اُس نے ایسا جان کر نہیں کیا۔اُسے اطلاع ملی کہ اُسکے گھر کے ارد گرد مشکوک سرگرمیاں ہو رہی ہیں، تو وہ سمجھ گیا کہ سوائے فرح کے اور کوئی نہ ہو گا۔اُس کے دل میں جزا، امی اور خصوصاً بشریٰ کی فکر لاحق ہو گئی۔پھر فرح کے پکڑے جانے کے بعد جو کچھ ہو، وہ نہ اُسکے دماغ نے سوچا تھا نہ تصور نے۔

البتہ۔۔۔

اسکا دوستوں کو ملانے کا۔۔

اپنی غلطی کو سدھارنے کا منصوبہ کامیاب ہوا تھا۔۔

وہ ایک دوسرے کو الزام دیتے رہے اور نوید خود کو۔۔۔

وہ معافیاں مانگتے رہے اور نوید اُنکو ملاتا رہا۔۔

وہ چھپ کر کام کرتا تھا۔۔

اور اُس نے وہی کیا تھا۔۔۔

اُس نے خود کو پچھتاؤں سے نکال لیا تھا۔۔

----------+---------+--------

**مورخہ سات اگست:**

پرانے آرٹسٹک فرنیچر سے سجا کمرہ، اِس وقت نیم اندھیرے میں تھا۔کمرے کی ایک کونے کی دیوار پر سجے اسلحوں، کے نیچے رکھی میز پر ایک ڈائری پر کچھ صفحات بکھرے پڑے تھے، جو میز پر رکھے پیلے اسٹڈی بلب کی روشنی میں واضح تھے۔ڈائری مکمل ہو چکی تھی، لیکن اُسکی

کہانی نہیں! لہٰذا وہ اب کورے صفحوں کا استعمال کر رہا تھا۔ آدھوں پر کام ہو چکا تھا اور آدھوں پر، سیاہ لباس میں، نیم اندھیرے کمرے میں گم ہوتا نوید عالم، جھکا ہوا بقایا کام مکمل کر رہا تھا۔ اُس نے صفحہ مکمل کر کے ایک مرتبہ اٹھا کر دیکھا۔ پھر مسکرایا۔

وہی دلفریب مسکراہٹ۔۔۔

مقابل کو مبہوت کر دینے والی۔۔۔

پھر اُس نے وہ صفحہ بقیہ صفحات کے اوپر رکھ دیا۔ اب وہ نیا صفحہ کھولے بقیہ کام مکمل کرنے لگا۔ میز کے پیلے بلب کی روشنی میں، اُسکا تھوڑی دیر قبل مکمل کیا گیا صفحہ واضح ہو رہا تھا۔ اُسکی خوبصورت لکھائی میں لکھے الفاظ اب نظر آنے لگے تھے۔

"اور پھر مئی کی تین تاریخ کو ایف آئی اے اُنہیں چھپتے چھپاتے شہر سے دور لے گئی۔ ایف آئی اے کہتی ہے کہ انہیں کوئی ایسا شخص نہیں ملا، جس نے اُن چھے لوگوں پر نظر رکھی ہو، وہ ٹھیک کہتی ہے۔ بھلا! میں کسی پر نظریں کیوں رکھوا تا؟ جبکہ میں اُنکے سایوں سے بھی زیادہ اُنکے قریب تھا۔ میں ہر ہر لمحہ باخبر تھا۔ چاہتا تو کہہ دیتا، پر نہیں! ایسے تو کھیل میں مزا نہ آتا۔ بچپن سے سب کہتے تھے کہ تمہیں کیا پتہ؟ تم فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو؟ تم زیادہ جانتے ہو کیا؟ تم بیچ میں نہ بولو، تمہیں کیا معلوم؟ **اٹینشن سیکر۔**

اٹینشن سیکر۔۔۔ یہ لفظ میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برستا تھا۔ لیکن یہ سچ ہے۔ میں ہوں اٹینشن سیکر! مجھے شوق ہے کہ لوگ میری عقل کے آگے حیران رہ جائیں۔ حیران بھی ایسے کہ وہ کسی بھی طرح میرے منصوبے کو بے نقاب نہ کر سکیں اور کر بھی لیں تو وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ میرا دل کرتا تھا کہ کہہ دوں فرّخ صاحب سے کہ یہ میں ہی ہوں۔ لیکن نہیں! تھوڑا اُن لوگوں کو مجھ سے چھپنے دو۔ تھوڑا اپنا دماغ چلانے دو، لیکن جتنا دماغ چلا لیں۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں جان سکتا کہ میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ اور کہاں سے اُنہیں دیکھ رہا ہوں؟ اِس کھیل میں مزا بہت آیا تھا۔

پھر وہ لوگ پہنچ گئے۔ اپنی جان بچاتے، مجھ سے چھپتے چھپاتے، وہ لوگ اُس پرانی حویلی پہنچ گئے۔

مجھ سے چھپتے۔۔۔ آہ۔۔۔ میں ہنسنا چاہتا ہوں۔

وہ مجھ سے چھپ رہے تھے۔ جبکہ میں تو سب جانتا تھا۔ پر کھیل جاری رہنے دیا کہ اصل مزا تو کھیلنے میں آرہا تھا۔

اور بالآخر جب وہ دماغ کے گھوڑے دوڑا کر ختم ہو گئے تو اتفاقاً گرفتار ہونے والے اظہر نے اُنکے سامنے میرا جرم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک انہیں پتہ چلا کہ یہ میں ہوں، تب تک وہ ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ اور نئے آنے والے ڈی آئی جی نے بھی اِس مقدمے کو مائیکل کے سر ڈال کر بند کر دیا۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ ساگر، فیصل اور شیراز کو شک ہے کہ یہ میں ہوں۔ پر وہ کچھ نہیں کر سکتے، وہ کیا، کوئی بھی میرا کچھ نہیں کر سکتا۔" اُس نے صفحے کے آخر میں دستخط کیے۔

شوقیہ دستخط۔۔۔

جو اُس نے اپنے عزیز دوست عمر سے سیکھا تھا۔۔۔

وہ جب کوئی نیا قلم چیک کرتا، تو پہلے دستخط کرتا تھا۔۔۔

ایک شوقیہ دستخط۔۔۔

اپنی کہانی مکمل کر کے کہانی نویس کھڑا ہوا۔ اُسکا لمبا قد نیم اندھیرے میں واضح تھا۔ اُس نے ڈائری اور کاغذات کا پلندہ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ باہر آیا تو آسمان پر صبح کے آثار نظر آنے لگے تھے پر روشنی نہیں ہوئی تھی۔ اب اُسکا رخ سمندر کی جانب تھا۔

سمندر کی لہریں بلند تھیں۔ مہینہ اگست کا تھا۔ اِن چند مہینوں میں گہرے سمندر میں جانے پر پابندی عائد رہتی ہے۔ صبح سات بجے کا وقت تھا اور ساحل پر عوام نہ ہونے کے برابر تھی۔

ایسے میں سیاہ سوٹ میں ملبوس ایس ایس پی نوید عالم، ہاتھوں میں کاغذ کے کچھ پلندے لیے سمندر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ آسمان پر چھائے گہرے بادلوں نے سورج کی روشنی کو زمین پر آنے سے روکا ہوا تھا، مونسون کا موسم تھا، بارش کسی بھی لمحے ہو سکتی تھی۔

صبح کی ہلکی نیلی، مگر سیاہی مائل روشنی میں، دلفریب مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ ساحل پر آ کھڑا ہوا۔ اُسکے ہاتھوں میں موجود صفحوں کی تعداد سو سے بھی زائد لگتی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے پنجوں کے بل بیٹھا اور پہلا صفحہ لہروں کی نذر کیا۔ بلند ہوتی لہریں صفحے کو لمحوں میں اپنا مسافر بنائے ساتھ لے گئیں۔ اُس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی، سیاہ سوٹ والے، اُس خوبرو مرد نے دوسرا صفحہ بھی پانی کی نذر کیا، پھر تیسرا اور اِسی طرح وہ تمام صفحے لہروں کے حوالے کرتا چلا گیا۔ اُسکے آس پاس کی لہروں میں کاغذوں کا ایک سمندر سا بن گیا۔ اُس نے آخری

صفحہ ہوا میں بلند کر کے دیکھا، اور ہنستے ہوئے اُسے بھی سمندر کے حوالے کر دیا۔ آخری صفحے پر موجود اُسکے شوقیہ دستخط آن کی آن میں غائب ہونے لگ گئے۔ جب تمام کے تمام صفحات لہروں کے ہم نوا بن گئے تو وہ کھڑا ہوا اور دور ہوتے صفحات کو دیکھا۔

''میں چاہتا تھا کہ ایف آئی اے مجھ تک پہنچے۔ پر وہ نہیں پہنچ سکی۔ اور یوں۔۔۔ کہانی ختم ہوئی۔''اُس نے ہنستے ہوئے لہروں کو دیکھا اور جانے کے لیے پلٹ گیا۔ جہاں آزاد زندگی اُسکا انتظار کر رہی تھی۔ ہاں! پچھتاؤں سے آزاد زندگی۔۔۔

سمندر کی بلند ہوتی لہریں، سیاہی مائل نیلی روشنی میں منظر کا حصّہ بنتے، اُس سیاہ سوٹ والے کو جیبوں میں ہاتھ ڈالے جاتا دیکھ رہی تھیں۔ جسے اب کبھی واپس نہیں آنا تھا۔

--------+---------+----------

نوید عالم آج بھی اپنے ذاتی کمرے میں نیم اندھیرے میں بیٹھا تھا۔ سیاہ لباس اُسکی شخصیت کا حصّہ تھا۔ کرسی پر پیچھے کی جانب چہرہ گرائے وہ کمرے میں سگریٹ کا دھواں چھوڑتا جا رہا تھا۔

کورے کاغذات کا پلندہ سامنے تھا۔۔۔

سامنے سیاہ بورڈ اور دو تصاویر لگی تھیں۔ دونوں ایک ہی شخص کی تھیں۔

**اے ایس پی شیراز۔۔۔**

ایک میں اُسکا چہرہ ہنستا مسکراتا روشن تھا۔۔۔

دوسرے میں خاموش، ویران اور سخت۔۔۔

سیگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے وہ سیدھا ہوا۔۔۔

کہانی نویس کے دماغ نے نئی کہانی تیار کر لی تھی۔۔۔

ایک نیا کردار سامنے تھا۔۔۔

ایک نئی کہانی منتظر تھی۔۔۔

----------+---------+--------

**(ختم شد)**

# حرف آخر

نحل ختم ہوا۔ میرا پہلا سلسلہ وار ناول، پہلا طویل ناول جو ایک سال اور تین ماہ جاری رہا۔ آپکے لئے یہ ایک ماہ اور تین سال تھا۔ پر میرے لیے یہ 2020 میں شروع کیا گیا ناول تھا۔ جس کے بارے میں، میں آپکو پیش لفظ میں بتا چکی ہوں۔ سب سے پہلے تو نحل کے کرداروں کے متعلق بات ہو گی۔ تو میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ کرداروں کو حقیقت سے قریب تر رکھوں۔ کسی بھی صورتحال میں انکا ردعمل، اُنکے جذبات واحساسات سے لوگ خود کو جوڑ سکیں نہ کہ یہ کہیں کہ ایسا صرف کہانیوں میں ہوتا ہے۔ اب میں اِس میں کتنا کامیاب ہوئی؟ یہ قارئین ہی بتا سکتے ہیں۔ ہاں! کچھ چیزیں اِس میں بھی غیر حقیقی ہیں اور وہ ظاہر ہے فکشن کا حصّہ ہوتی ہیں۔

کرداروں کی فرداً فرداً وضاحت دینے سے قبل اِس ناول کے نام کی وضاحت دینا چاہوں گی ایک مرتبہ پھر سے۔ یہ کسی بھی سورۃ کے نام پر نہیں رکھا گیا ہے۔ نہ اسکا قرآنِ پاک جیسی عظیم شے سے کوئی ذرّہ برابر بھی تعلق ہے اور نہ میں اِس قابل ہوں۔ اردو ادب کا خاصا رہا ہے کہ ہم بات کو خوبصورت بنانے کے لیے عربی و فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پھر چاہے شاعری ہو یا نثر۔ مجھے بھی نام شہد کی مکھی رکھنا تھا۔ لیکن وہ نام پُرکشش نہ لگا۔ فارسی نام مشکل تھا البتہ عربی نام کافی پُرکشش لگا، تو اُسے ہی حتمی قرار دے کے کہانی کا عنوان بنا دیا۔ اسکا نام نحل صرف شہد کی مکھی سے مماثلت کی بنا پر ہے۔ اتنی وضاحت کے باوجود بھی کوئی اسے زبردستی کسی سورۃ سے جوڑنے یا ملانے کی کوشش کرتا ہے، تو یہ اُسکا اپنا قصور ہے، میرا نہیں!

میں نے نحل کے کرداروں میں مختلف کہانیاں سموئی تھیں، مختلف حالات وواقعات اور انسانی زندگی پر اُسکے اثرات۔ بہت چھوٹے چھوٹے مسائل تھے، جنہیں ہم توجہ دیں تو زندگیاں بہتر ہو سکتی ہیں۔

اور آج میں آپکو ایک مزے کی بات بتانا چاہتی ہوں۔ مقدّم، حسین، علی، نوید، رضا اور عمر۔ یہ چھے الگ کہانیاں تھیں۔ اِن پر مجھے چھے الگ ناولٹ لکھنے تھے۔ لیکن، قسمت چاہتی تھی کہ میں انہیں جوڑ کر ایک ہی کہانی کے کردار بنا دوں۔ تو قسمت کی مرضی! اور قسمت نے بہتر چاہا۔

میں کامل کردار لکھنا پسند نہیں کرتی۔ کیونکہ کامل کوئی نہیں ہے۔ ہر انسان خود غرض ہے، ہر انسان کہیں برا ہے، اور ہر انسان کے اندر شر چھپا ہے۔ اور میرے کرداروں میں آپ نے یہ بات دیکھ لی ہے۔ ان کے اندر برائی بھی تھی، بعض جگہ ان کے فیصلے اور اقدام آپکو برے

بھی لگے اور بعض جگہ آپ نے محسوس کیا کہ ہاں! ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ یہی چیز نحل کے کرداروں کو حقیقت سے قریب تر بناتی ہے۔ میرے ناول میں کوئی پرفیکٹ نہ تھا۔

**فاطمہ،** اپنی خواہشات کے لیے اُس نے ناجائز راستہ اختیار کیا۔ بیشک علی غلط تھا، لیکن جتنی وہ فاطمہ سے محبت کرتا تھا، اگر وہ چاہتی تو کچھ عرصے اسے اکیلا چھوڑ دیتی، اُس سے ناراض ہو جاتی تو یقیناً! اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔ لیکن اُس نے ایک بالکل ہی غلط راستہ چن کر اُس سے دوگنا غلطی کی۔ لیکن میں چاہتی تھی کہ لوگ برے کو سدھرتا بھی دیکھیں۔ نفرت برائی سے کریں، انسان سے نہیں! کیونکہ اگر ہم انسان سے نفرت کریں گے تو پھر اُنہیں کبھی معاف نہ کر سکیں گے۔ لوگوں نے کتنے بڑے بڑے ظلم کیے، پر جب اسلام قبول کیا تو اُنہیں کھلے دل سے قبول کیا گیا۔ کیوں؟ کیونکہ نفرت اُن کے گناہ سے کی گئی تھی، اگر اُن سے کی جاتی تو کوئی انہیں دین اسلام میں قبول نہ کرتا۔

جزا کا کردار ہمارے یہاں کی ایک ٹپیکل (عمومی) بہن کا کردار تھا۔ جسے لگتا ہے کہ اسکے بھائی اگر گھر سے الگ ہو گئے تو وہی اُسکے ماں باپ کی موت کے ذمّے دار ہیں۔ جسے لگتا ہے کہ جو بیٹا ماں باپ کے ساتھ نہ رہا، اُسکا جائیداد میں کوئی حصہ نہیں۔ جو ضد اور انا میں جو منہ میں آئے کہہ دیتی ہے۔ جزا در حقیقت ہمارے یہاں کے عمومی بہن بھائیوں کی عکاسی تھی۔ جو دنیا کے لیے تو اچھے ہوتے ہیں، پر اپنے ہی بہن بھائیوں سے انکی نہیں بنتی۔

بشریٰ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اُس نے کبھی اپنے لیے آواز نہیں اٹھائی۔ وہ سر جھکائے سب سہتی جاتی تھی، اور جب اُسکی بس ہو جاتی تو وہ یکدم پھٹ پڑتی۔ یکدم پھٹ پڑنا اچھا نہیں ہوتا۔ انسان وہ سب کہہ دیتا ہے، جو اُسکے لاشعور میں کہیں چھپا ہوتا ہے۔ اُسکا غیر متوازی رویہ ہی اُسکا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اُس نے نہ کبھی ماں باپ کے سامنے اپنے حق کے لیے آواز اٹھائی، نہ سسرال والوں کے اور نہ نوید کے سامنے۔ اور جب پھٹ پڑی، تو ہر شے کا الزام نوید کو دے ڈالا۔

مقدس، عمارہ، لیلیٰ، حور عین یہ سب کہانی کے ثانوی اور سائیڈ کردار تھے۔ جنکا کہانی سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ وہ نہ کوئی سبق دے رہے تھے نہ اُنکی کوئی خاص کہانی تھی، یہ صرف کرداروں کی ضرورت تھے۔ لہٰذا ان پر زیادہ وقت دینا ضروری نہ تھا۔

اب آجائیں مرکزی کرداروں پر تو علی کا کردار میرا سب سے پسندیدہ تھا۔ (نہیں! اسکی حرکتیں نہیں)۔ وہ بطور کردار مجھے اِس لیے پسند ہے کہ اُسے میں نے جیسا سوچا تھا، وہ بالکل ویسا ہی گیا۔ اُس میں شروع سے آخر تک جتنی تبدیلیاں مجھے آہستہ آہستہ لانی تھیں، وہ بالکل

ویسے ہی رہیں۔اُس میں کوئی ردوبدل نہ ہوئی نہ اُس میں میری طرف سے کوئی کمی رہی۔مجھے ایسا لگتا ہے کہ ایک کردار کی ڈیولپمنٹ کے حساب سے علی کا کردار شاندار رہا۔وہ جذباتی، غلط فیصلے کرنے والا، ہر وقت ہر ایک سے ناراض رہنے والے علی سے، آہستہ آہستہ بات کو سمجھنے والا، بردبار، سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے والا علی بنا۔اور یقیناً یہ تبدیلی اچانک نہیں آئی ہو گی۔باقی قارئین بہتر بتا سکتے ہیں۔

نشمیہ، میں نہیں جانتی کتنے لوگ اسے مرکزی کردار سمجھتے ہیں یا نہیں؟ مگر میرے لیے نشمیہ علی، ایک مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرے لیے اِسکا کردار لکھنا سب سے مشکل تھا۔اُسکی وجہ یہ تھی کہ کرداروں کو لکھنے کے لیے اُنکی جگہ پر آکر ہر شے سوچنی ہوتی ہے۔خود کو انکی جگہ پر رکھنا ہوتا ہے کہ وہ اُس صورتحال میں کیسا ردعمل دیں گے۔ہر کردار کا ردعمل اُنکے مزاج کے حساب سے لکھنا ہوتا ہے۔ایک بچہ کیسے بات کرتا ہے؟ کیسے سوچتا ہے؟ یہ لکھنا سب سے مشکل کام تھا۔بعض جگہ نشمیہ کے مکالمے لکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا، جیسے ایک چار سالہ بچی کے لیے یہ بہت بڑے ہیں، تو میں انہیں تبدیل کر دیتی۔بعض جگہ ایسا لگتا جیسے بہت بونگے الفاظ لکھ دیے ہیں جو نشمیہ کے مزاج کے خلاف ہیں۔تو اُنہیں بھی تبدیل کرتی۔عرض یہ کہ اس کردار میں بہت محنت لگی لیکن اتنا ہی یہ سب کو پسند آیا۔نویں قسط میں اسکا آنا ہی اس پوری کہانی کو تازگی بخش گیا تھا۔

رضا کا شماران لوگوں میں تھا، جو اپنے دشمن آپ ہوتے ہیں، مایوس ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خدا اُنکے ساتھ کبھی اچھا نہیں کرے گا۔کبھی خود ترسی سے باہر ہی نہیں آنا چاہتے۔اِس کردار کی میں مزید کیا وضاحت دوں؟ ہر وضاحت کہانی میں ہو چکی ہے۔

مقدّم ایک ہلکا پھلکا سا کردار تھا لیکن اگر غور کریں تو کافی جگہ وہ خود غرض تھا۔اُس نے لیلیٰ کو علی کے اوپر چنا۔اچھا کیا، لیلیٰ بیشک ضروری تھی۔پر اُسے کم از کم کوشش کرنی چاہیے تھی کہ وہ اپنے کسی دوست کو رابطہ کر کے بتا دے۔وہ چاہتا تو کر سکتا تھا پر اُس نے نہیں کیا۔ مقدس کے معاملے میں بھی وہ اکثر خود غرض بن جایا کرتا تھا۔پہلے اپنے فیصلے کو فوقیت دیتا تھا پھر اُسے۔اِس کردار میں کوئی خاص تبدیلی نہیں لائی گئی کیونکہ مجھے تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔

عمر کا کردار اپنے اندر بہت بڑا سبق لیے ہوئے تھا اور مجھے امید ہے کہ وہ سبق سب تک پہنچ چکا ہو گا۔حد سے زیادہ حساس ہونا، ضرورت سے زیادہ دوسروں کا سوچنا انسان کو اسی دوراہے پر لاتا ہے، جس پر عمر پہنچ گیا تھا۔کل کیا ہو گا؟ کون مرے گا؟ کون جیئے گا؟ یہ سوچنا انسان کا کام نہیں ہے۔رب کا ہے۔عمر نے اپنی زندگی سے سبق حاصل کیا یا نہیں! پر مجھے امید ہے کہ آپ لوگوں نے ضرور کر لیا ہو گا۔

**حسین،** میں نہیں جانتی لوگ اس کردار کو کیا سمجھتے ہیں؟ شاید ایک ہنستا مسکراتا کردار؟ پر اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ کردار کنویں سے بھی زیادہ گہرا تھا۔ یہ واحد شخص تھا جو دل میں بغض، عداوت، کینہ نہیں پالتا تھا۔ یہ نہیں سوچتا تھا کہ کس نے اُسکے ساتھ کیا کیا؟ بس اتنا سوچتا تھا کہ زندگی چار دن کی ہے، لڑ کر گزارنے سے بہتر معاف کر دینا ہے۔ مجھے حسین پسند تھا۔

نوید۔۔۔آہ! ایس ایس پی نوید عالم۔ یقیناً اب تک آپ سوچ رہے ہوں گے کہ نوید کو ہی ان تمام کاموں کے لیے کیوں چنا گیا؟ یہ بات باب تین میں ہی واضح کر دی گئی تھی، پھر باب تیرہ میں بھی۔ شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار اگر کوئی انسان تھا تو وہ نوید تھا۔ اور اُس کے بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک، ملنے والی تربیت اور ماحول نے اُسے ایک عام انسان سے ایک نفسیاتی بنا دیا تھا۔ نفسیاتی وہ نہیں ہوتا جو پاگل ہو، نفسیاتی وہ بھی ہوتا ہے، جو عام انسانوں سے زیادہ اُلجھا ہوا ہو۔ ٹرامٹائز ہو۔ نوید نے اپنے اندر تبدیلی پائی یا نہیں؟ یہ آپ بتائیں گے۔ نوید ایسا ہی ہے اور شاید ایسا ہی رہے۔ اُسکے ذہنی مسائل بہت زیادہ ہیں۔ ہمارے آس پاس نظر آنے والے، عام زندگی گزارنے والے بہت سے کرداروں کے اندر کوئی نہ کوئی نوید چھپا ہو سکتا ہے، اور ہم انہیں پہچان بھی نہیں سکتے۔ اور یہی نوید تھا۔ وہ انہی لوگوں کی عکاسی تھا۔ نوید میرا پسندیدہ کردار تھا۔ ہاں! میں اگر ایک قاری کی حیثیت سے کسی کو پسند کروں تو وہ نوید ہے۔

ناول میں بیشتر جگہ اُسکے متعلق ہنٹ دے دی گئی تھی۔ کچھ بھٹکانے کے لیے تھی اور کچھ اُس تک پہنچنے کے لیے۔ سب سے بڑی ہنٹ تو اُسکا بچپن تھا۔ اُسکا ڈائری نہ لکھنا، اُسکا سیاہ لباس اور اُسکی دلفریب مسکراہٹ۔ بہت سے لوگ اُس تک پہنچ گئے، بہت سوں نے یہ بھی بتایا کہ کوئی دوست ہی سب کو ملوانے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔ لیکن صحیح وجہ کسی نے نہ بتائی کہ نوید ایسا کرے گا تو کیوں؟ وجہ یہی تھی کہ وہ نوید عالم تھا۔۔۔ہاہاہا۔

اور شیراز، بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ شیراز کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ شیراز تو ایک سائیڈ کردار تھا، تو پھر بھی اُس نے آپکے دلوں پر اتنا اثر کیوں ڈالا؟ تو وجہ شیراز کے کردار سے اِس حقیقت کا پردہ چاک کرنا تھا کہ اِس ملک میں انصاف کسی کسی کو ہی ملتا ہے۔ مقصد یہ دکھانا تھا کہ اگر ہماری فورسز ایمانداری سے کام کرتی ہیں، تو انہیں کیا کیا جھیلنا پڑتا ہے۔ یہ سلوک میں کسی مرکزی کردار کے ساتھ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے شیراز کا ذکر کم رکھا کہ دکھ کم ہو۔

کچھ لوگ یہ بھی کہیں گے کہ نوید سیدھا سیدھا کہہ دیتا، بات ختم۔ لیکن نوید کے کردار و مزاج کے خلاف یہ بات ہوتی، اور پھر وہی بات اگر نوید کہہ دیتا تو ناول کیسے بنتا؟ نوید کو اپنے دوستوں کو پھر سے دوست بنانے کے لیے وقت درکار تھا۔ اور وہ اسی صورت اُسے ملا۔

خیر! میں جانتی ہوں کہ بہت سی باتیں رہ گئی ہوں گی۔ لیکن مجھے بس مزید کچھ نہیں کہنا۔ آپ نے اگر ان کرداروں سے سیکھا، اور ان سے خود کو جوڑ سکیں، ان سے عبرت حاصل کی تو میرا مقصد پورا ہوا۔

ژیلہ ظفر

اب نیچے آپکے سوالات کے جوابات ہیں۔ ملاحظہ فرمالیں۔

**سوال: آپ نے کرداروں کو مرد ہی کیوں رکھا؟ چھے خواتین دوست کیوں نہیں؟**

جواب: کیونکہ خواتین میں مجھے وہ مارجن نہیں مل پاتا، جو مردوں کردار کے ذریعے مجھے ملا۔ خواتین اِس طرح بار بار نہیں مل پاتیں ایک دوسرے سے جیسے مرد، پھر خواتین کا شادی شدہ بال بچوں والی ہوتے ہوئے دوسرے شہر جانا، چھپ کر رہنا بہت مسائل ہوتے، پھر اُن پر الگ سے لکھنا پڑتا۔ مزید یہ کہ خواتین سے پھر کوئی ریلیٹ نہ کرتا، اگر وہ بھی مردوں کی طرح بڑے آرام سے کہیں بھی آجا سکتی۔ لوگ کہہ دیتے کہ حقیقت میں عورت کو اتنی آزادی نہیں ہے۔ تو ان کہانیوں کے لیے مرد کردار بہتر تھے۔ پھر مجھے مردوں کے جذبات بھی دکھانے تھے، جنہیں ہمارے یہاں پتھر سمجھا جاتا ہے۔

**سوال: علی نے فاطمہ کو معاف کیوں کیا؟ ایک دھوکے باز کو معافی کیوں؟**

جواب: میں نے اوپر ہی بتایا کہ گناہ سے نفرت کریں، گناہ گار سے نہیں۔ یقیناً علی کے فیصلے پر آپکی بھی کوئی رائے ہوگی۔ یقیناً آپ اس پر اختلاف بھی رکھتے ہونگے۔ لیکن! کیا آپ نے اندازہ کیا کہ علی اور فاطمہ کے ٹریک میں درحقیقت یا یوں کہہ لیں کہ پس پردہ کونسا موضوع خاموشی کے ساتھ زیرِ بحث لایا گیا ہے؟

کیا دھوکہ؟ دھوکے کا انجام؟ اپنی ذمّے داریوں سے بھاگنے کا نتیجہ؟ نہیں!

اِسکا اصل موضوع تھا حلالہ۔۔۔۔جی ہاں! آپ نے صحیح سنا۔ مجھے اس ٹریک کا انجام یہی کرنا تھا۔ پھر چاہے کوئی پسند کرے یا نا پسند۔۔۔

ہمارے معاشرے میں حلالہ کے نام پر جو غلط رواج قائم ہے، اُسے ہی ہم نے عموماً ناولوں میں دکھایا ہے، اور اُسے ہی دکھاتے ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ ہم نے یہی دیکھا ہے۔ اول تو حلالہ نام کا کوئی لفظ اسلام میں موجود نہیں ہے۔ یہ برصغیر کی پیدا کردہ اصطلاح ہے۔ تو معاملہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں اس موضوع پر لکھا جاتا ہے، اور اُسکی روک تھام پر بات کی جاتی ہے۔ جو کہ بالکل درست ہے۔ لیکن ہم بھول گئے کہ ایک عورت، دوسری شادی میں طلاق یا بیوہ ہونے کی صورت میں دوبارہ اپنے پہلے شوہر سے شادی کر سکتی ہے۔ یہ ایک درست عمل ہے۔ بشرطیکہ اس میں نہ کوئی کنٹریکٹ شامل ہو، اور نہ ہی دونوں فریقین نے پہلے سے یہ طے کر رکھا ہو۔ یہ ایک حادثے کی صورت میں دوبارہ ہو جائے تو پھر آپکے پاس پہلے شوہر کا آپشن موجود ہوتا ہے۔ اس پر ہم نے بات نہیں کی۔ معاملہ یہ ہے کہ جب کسی شے کو غلط قرار دیا جائے، یا کسی شے کو ناجائز طریقے سے کیا جائے تو ہماری ذمّے داری ہے کہ اُس شے کا جائز اور صحیح رخ بھی دکھائیں۔

علی اور فاطمہ کے ٹریک میں، میں نے بس ایک وہ ہی سرسری سی کوشش کی ہے۔ اور میں نہیں جانتی کہ کتنے لوگ اس پس پردہ سبق کو کھوج پائے؟ فاطمہ نے علی سے طلاق لی، اور اس میں غلطی تھی تو دونوں کی ہی، پر یقیناً فاطمہ نے زیادہ غلط قدم اٹھایا۔ پر علی بھی بری الزمہ نہیں ہے۔ اب یہ آپ بتائیں گے کہ دونوں میں سے زیادہ غلط کون تھا؟

**سوال: کیا نحل میں حقیقی زندگی میں سے کوئی کردار لیا گیا ہے؟**

جواب: نحل کے کرداروں کی ذاتی کہانیاں ہمارے معاشرے سے ہی لی گئی ہیں۔ مشاہدے کی بنا پر انھیں لکھا گیا ہے۔ البتہ اگر آپ یہ پوچھنا چاہ رہی ہیں کہ کیا کوئی کردار اصلی ہے تو نہیں، کسی کردار کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب تخلیقی اور فرضی کردار ہیں۔

**سوال: نحل لکھنے کا آئیڈیا کہاں سے آیا؟**

جواب: اِس سوال کا جواب تو نہ میرے پاس ہے اور نہ مجھے لگتا ہے کہ کوئی اور لکھاری دے سکتا ہے۔ کیونکہ ہمیں خود نہیں معلوم ہوتا کہ خود بخود ایک خالی ذہن میں آئیڈیا کہاں سے آسماتا ہے؟ یہ تو اللہ کی مرضی ہے یقیناً۔ باقی نحل کے ہر کردار کی کہانی الگ الگ میرے ذہن میں تھی، اُسے جوڑ کر ایک ناول بنایا گیا۔ بعض خیالات ناول کے دوران آئے، بعض چیزیں بعد میں تبدیل کی گئی۔

**سوال: علی صنوبر کے کیس کے لیے اتنا پوسیسیو کیوں تھا؟**

جواب: غالباً اِسکا جواب آپ لوگ علی کی زبانی پڑھ چکے ہیں۔ لیکن میں دہرا دیتی ہوں، کہ اُسکے باپ نے پہلی بار اُسکا ساتھ دیا تھا۔ اُسے فخر سے دیکھا تھا، اور وہ اپنے باپ سے اِس شاباشی کی خاطر پیچھے نہیں ہٹنا چاہتا تھا۔ شروعات میں تو وہ فطری غم و غصّے کی وجہ سے اُس کیلئے آواز اٹھا رہا تھا۔ لیکن بعد میں اُسکی غرض شامل ہو گئی تھی۔

**سوال: نوید کی بہن جزا کا رویہ اتنا تلخ کیوں تھا بھائیوں کے ساتھ؟ کیا صرف جائیداد مانگنا اتنا بڑا گناہ ہے؟**

جواب: یہ سوالات مجھے حیران کر رہے ہیں، اِنکے جواب تو ناول میں ہی مل جانے چاہیے تھے۔ جزا کا خط دوبارہ پڑھیے، آپکے تمام سوالات کے جوابات وہاں ہیں۔ پھر اُن بہن بھائیوں کا رشتہ ہمیشہ سے بہت اچھا نہ تھا ایک دوسرے کے ساتھ، اُنکے درمیان کمیونیکیشن گیپ بہت زیادہ تھا۔

**سوال: کیا مزاح حسین کی طرح، اچھی ازدواجی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے، جس کی کمی دوسرے جوڑے میں تھی؟**

جواب: مزاح خوشگوار زندگی کا جز تو ہو سکتا ہے لیکن خوشی کا ضامن نہیں۔ بہت سے لوگوں کا مزاح صرف دوسرے کا مذاق اڑانا ہوتا ہے۔ اصل شے ایک دوسرے کی حیثیت کو تسلیم کرنا، اور ایک دوسرے کو عزت دینا ہے۔ اچھی زندگی تو نوید اور بشریٰ کی بھی تھی، درمیان میں غلط فہمی ضرور ہوئی لیکن وہ ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ باقی ہمیں حسین اور حور عین کو پڑھنے میں اِس لیے خوشگواری کا احساس ہوا کہ مزاح انسان کے مزاج پر اچھا اثر ڈالتا ہے۔ وہی پڑھنے والوں کے ساتھ ہوا۔

**سوال: ہم اپنی غلطیوں کے وکیل اور دوسرے کی غلطیوں کے جج کیوں ہوتے ہیں؟**

جواب: یہی تو انسان کا عمومی رویہ ہے جو معاشرتی برائیوں کا جڑ ہے۔ اسکا حل ہمیں دین اسلام دے کر گیا ہے۔ انسان کے اندر موجود اکڑ اسے ہمیشہ دوسرے سے بالاتر سمجھتی ہے، ہم دوسروں کو ہمیشہ برا اور چھوٹا ہی سمجھتے ہیں۔ اور اسی طرح اکڑ انسان کو معافی بھی نہیں مانگنے دیتی، وہ خود کو فرشتہ سمجھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ دین ہمیں یہ سکھا کر گیا ہے کہ دوسرے کے ساتھ عفو درگزر کیا جائے اور اپنی غلطی کو تسلیم کیا جائے۔ اب ایسا کیوں ہے یہ تو میں نہیں بتا سکتی۔ پر اسکا حل میں نے آپکو دے دیا ہے۔ اپنے اندر سے اکڑ و تکبر ختم کرنا ہی دونوں مسائل کا حل ہے۔

**سوال: کسی کو قتل کرنا کتنا خطرناک کام ہے۔ کوئی اتنا ظالم و بے حس کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان کی جان لے لے اور پھر اُسکا جواز بھی تلاش کر لے؟**

جواب: دیکھیں! شاید انسان پیدائشی طور پر اتنا بے حس نہیں ہوتا کہ کسی کی جان لے اور اُسے کچھ محسوس ہی نہ ہو۔ زیادہ تر انسان، پہلے اپنے اندر موجود اُس آواز کو خاموش کرتا ہے، جو اُسے بتاتی ہے کہ سامنے والا بھی اسی کی طرح جیتا جاگتا انسان ہے۔

پھر آہستہ آہستہ وہ جواز بناتا ہے۔ ''وہ اسی کے قابل تھا، اس نے میرے ساتھ برا کیا تھا، میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا، میں نے صرف بدلہ لیا ہے، اگر میں اسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتا۔'' وغیرہ۔

اور شاید یہی سب سے خوفناک چیز ہے۔ انسان گناہ کرنے سے پہلے اپنے ضمیر کو قتل کرتا ہے، پھر کسی اور کو۔ یاد رکھیں، قاتل کبھی خود کو قاتل نہیں سمجھتا۔ وہ خود کو مظلوم سمجھ سکتا ہے، بدلہ لینے والا سمجھ سکتا ہے، محافظ سمجھ سکتا ہے، حتیٰ کہ کبھی کبھی حق پر کھڑا ہوا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔

شیطان اُسے یہ نہیں کہتا کہ ''جاؤ! ایک بے گناہ کو قتل کرو۔ وہ پہلے کہتا ہے ''بس ایک بار! تم مجبور ہو، تمہارا حق ہے، وہ اسی کا مستحق ہے۔''

اور جب انسان پہلی بار اپنے ضمیر کے خلاف قدم اٹھا لیتا ہے، تو اگلی بار اُسے وہی کام کرنے کے لیے اتنی بڑی جنگ نہیں لڑنی پڑتی۔ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ کوئی انسان قتل کیسے کر سکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ وہ انسان اپنے اندر کے اُس شخص کو کہاں کھو آیا تھا، جو کبھی قتل کو قتل سمجھتا تھا؟

**شکریہ**